شعلۂ سخن

(مجموعۂ کلام)



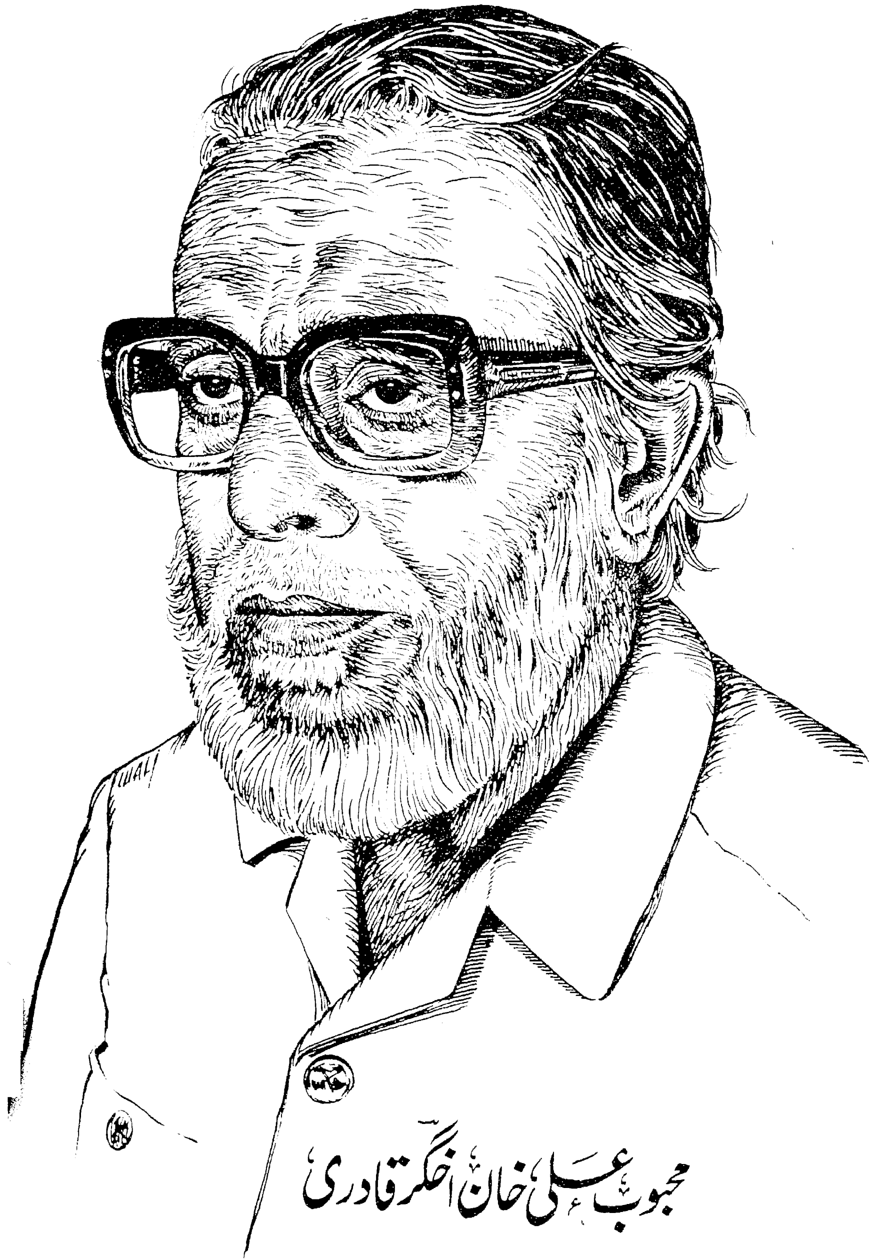
محبوب علی خاں اخگر قادری

○ کتاب : شعلۂ سخن
○ صفحات : (۲۰۴)
○ مصنف : محبوب علی خاں اخگر
○ سال اشاعت : جنوری ۱۹۹۴ء
○ تعداد : (۵۰۰)
○ قیمت : Rs. 50/- پچاس روپے
○ کتابت : محمد عبدالرؤف سرورق : ریاض خوشنویس
○ سرورق : ولی محمد صدیقی آرٹسٹ۔ جمال مارکٹ (ART SPAN)
○ طباعت لیتھو : دائرہ پریس چھتہ بازار
○ طباعت سرورق : چرسما آفسیٹ پرنٹر خیریت آباد
○ تصاویر : امتیاز پریسیڈنٹ فوٹو اسٹوڈیو۔ شمع ٹاکیز۔ جہاں نما
○ جلد بندی : حفیظیہ بک بائنڈنگ۔ چھتہ بازار حیدرآباد۔
● اعانت : (جزوی) آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد

○ زیراہتمام :
● محمد جعفر علیخاں نعیم ● مختار احمد خاں ● میر محمد اقبال علی

○ ملنے کے پتے :
● حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد۔
● اسٹوڈنٹس بک ہاؤس۔ چارکمان۔ حیدرآباد۔
● "اخگر نصیب منزل" 19-3-262/17/2
جہاں نما۔ حیدرآباد۔ 500253

فون 522122
526382
○ پرویز نیاکس : 0842-526285



محبوب علی خان اخگر قادری

ترتیب

اخگر ۔ بیک نظر

نام ۔ محبوب علی خاں

تخلص ۔ اخگر قادری

ولدیت ۔ محمد بہادر خاں مرحوم

تاریخ پیدائش ۔ ۵ر نومبر ۱۹۲۵ء

مقام پیدائش ۔ دیوڑھی نواب مدن خاں کولسہ واڑی چیلہ پورہ حیدر آباد

علمی قابلیت ۔ میٹرک (عثمانیہ) منشی (نظامیہ)

ملازمت ۔ اولاً سررشتہ کروڑگیری بحیثیت نائب امین ثانیاً ڈپٹی تحصیلدار محکمہ مال ۔

تاریخ وظیفہ ۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۸۳ء

تلمذ ۔ (۱) محمد فصیح الدین مہر، (۲) میر محمد علی فقیر، (۳) حضرت علامہ علی حادی جانشین حضرت صفی اورنگ آبادی ۔

تصانیف ، (۱) تلامذۂ صفی اورنگ آبادی [آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی ایوارڈ یافتہ] (۲) خیالات حادی (۳) اصلاحات صفی اورنگ آبادی ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنتساب

اپنی دونوں لڑکیوں

غوثیہ بانو سعید

دولت بانو اور

نبیرہ مرتضیٰ علی خاں

کے

نام

کچھ شعلۂ سخن کے بارے میں!

جناب محبوب علی خاں اخگر ایک بے لوث، مخلص ہنرمند و ہنر شناس انسان ہیں۔ حیدر آباد اور بیرون حیدر آباد اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے اچھی طرح پہچانے جاتے ہیں۔ اب تک ان کی تین تالیفات منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ "تلامذہ صفی، خیالاتِ حاوی اور اصلاحاتِ صفی۔ اب اِن کا اپنا شعری مجموعہ "شعلۂ سخن" طبع ہو رہا ہے، جس میں حمد، نعت اور مناقب کے بعد [۱۳۷] غزلیں شامل ہیں۔

اخگر صاحب ایک وضع دار شخصیت کے مالک ہیں۔ نفسیاتی اِعتبار سے ایسی شخصیتیں ماضی کی بہترین روایات سے اپنا رشتہ کسی قیمت پر نہیں توڑ سکتیں۔ دبستانِ صفی میں بھی ان روایات کا بڑا احترام ملتا ہے۔ اخگر صاحب کی غزل دبستانِ صفی کی روایات کی اہم کڑی ہے جس میں مذہبی، صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کا تقدس صاف نظر آتا ہے۔

آج کا شعری مزاج استعاروں اور علائم کا اس حد تک گرویدہ ہو گیا ہے کہ اسے ابلاغ و ترسیل کی ناکامیوں کا بھی احساس نہیں رہا۔ بات تو جبھی بنتی ہے جب کوئی اِسے تھوڑے سے تکلف اور غور و فکر کے ساتھ سمجھ لے۔ ورنہ "المعنی فی البطن الشاعر" سے کیا حاصل؟ شعر خواہ علائم کا گنجینہ ہو



ڈاکٹر اشرف رفیع

واضح ہو یا بیانیہ اس میں دل و دماغ کو متاثر کرنے، احساسِ جمال کو تسکین دینے کی صلاحیت بھی ہو تو وہی شعر اچھا کہلاتا ہے۔ اخگرؔ صاحب کی غزلیں اس وصف سے خالی نہیں۔ کارگہہ ہستی کے تیز و تند، نرم و نازک لمحوں کو انہوں نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبی اور ہلکی سی رمزیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے عصر کی وسعتیں، اس کے نشیب و فراز، ہمعصر زبان اس کا آب و رنگ شعلۂ سخن کی روشنی میں اچھی طرح جھلکتا ہے۔

اخگرؔ صاحب ایک خوش گو اور صاحب طرز غزل گو ہیں خوب کہتے ہیں مگر کم آمیز ہیں۔ مشاعروں میں عام طور پر شریک نہیں ہوتے شاید اسی لئے بہ حیثیت شاعر ان کی شہرت ویسی نہیں ہوسکی جس کے وہ بجا طور پر حق دار ہیں۔

ڈاکٹر اشرف رفیع
(شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

۲۳ / مئی ۱۹۹۳ء
یاقوت پورہ۔

انگر کے شعری شعلے

جناب محبوب علی خاں اخگر نے جس زمانے اور ماحول میں آنکھیں کھولیں اس زمانے اور اس ماحول میں صنف غزل تفریح طبع اور کرتب بازی کا شکار ہو چکی تھی اور اس سے غزل کے وہ اوصاف جو غزل کو جان سخن بنائے رکھتے ہیں ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے زمانے اور ماحول کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑ ہی گیا ہوتا اگر انھوں نے اپنے ذاتی احساس و فکر کو زندہ و تابناک رکھنے کے لیے کاوش اور دیدہ ریزی سے کام نہ لیا ہوتا۔

بیشتر شعراء کے سلسلے میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ان کے فکری تجربے ہی ایک دوسرے سے مماثل نہیں ہوتے بلکہ اظہار کی ہیئتیں بھی یکساں ہوتی ہیں۔ شاید یہ غزل کی صنف کا جبر بھی ہے جو بہت جلد نئی ترکیبوں، اصطلاحات اور پیکروں کو بھی معمولات کے دائرے میں پہنچا دیتا ہے۔ بیشتر شعراء نے بعض جیسی اور فکری مسائل کے اظہار کو شاعری کے لیے اساس سمجھ لیا ہے۔ تنہائی، مستقبل کا خوف، گھر اور معاشرے کے بکھرنے کا احساس، تہذیب و معاشرہ کی بے روح یک رنگی وغیرہ، یقیناً ہمارے عہد کے مسائل ہیں اور ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کے کسی شاعر کے کمرے میں انیسویں صدی کے کیلنڈر کی تلاش بھولے پن ہی کی دلیل ہو سکتی ہے! زندگی کے بہت سے پہلو ایک جیسے ہیں تو حالات کے ردِّ عمل میں بھی کسی قدر یکسانیت کا ہونا ناگزیر ہے لیکن شاعری صرف بیان واقعہ کا نام نہیں کیوں کہ یہ کام اخباروں سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں ضرورت ہے اجتماعی تجربوں یا عام تہذیبی مسائل کو بھی



نظیر علی عدیلؔ

اپنے ذاتی اور انفرادی رویّے سے آمیز کرنے کی۔ اور اپنے تخلیقی عمل کے آزاد سفر میں اظہار اور ہیئت کی نئی سمتوں تک پہنچنے کی۔ مسائل اور موضوعات سے تعارف کے ہزاروں وسیلے ہیں لیکن سچی تخلیقی استعداد اپنے ہی باطن کی قوت اور شعور کی برکت و بصیرت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ دولت ہُنر کمیاب ہے۔ جناب اخگر کے شعری شعلوں میں بھی عام طور پر ان تہذیبی مسائل، تجربوں اور افکار کی بازگشت ملتی ہے جو ہمارے عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دُنیا کی ہر زندہ زبان کے ادب کا مزاج بن چکے ہیں۔ جناب اخگر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صاف سُتھرے اور منظم طریقے سے ان تجربات کے اظہار کا ہُنر بھی رکھتے ہیں اور زبان و بیان کے رموز سے بھی واقف ہیں۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا بے ساختہ لہجہ اور نکیلاپن اچھی غزل کا مذاق رکھنے والوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے کلام میں بعض نمائندہ شعراء کی واضح پرچھائیوں کے باوجود لہجے کی بے ساختگی اور زبان کی صفائی متاثر کرتی ہے۔ ہر چراغ کہیں نہ کہیں سے روشنی مستعار لیتا ہے لیکن اس کی منزل کمال یہ ہوگی کہ ایک بار اچھی طرح روشن ہونے کے بعد وہ اپنی روشنی میں برابر اضافہ کرتا جائے۔ جناب اخگر کے شعری شعلوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔

جناب اخگر حضرت غلام علی حادی کے تلمیذ ہیں جو ایک باکمال شاعر و ماہر عروض داں اور حضرت صفی اورنگ آبادی کے حقیقی جانشین گزرے ہیں۔ حضرت حادی نے جناب اخگر کی جو شعری رہنمائی کی وہ برائے نام نہیں تھی بلکہ حقیقتاً انھوں نے ان کو نکھار دیا۔ افسوس کہ حضرت حادی کی زندگی نے اتنی وفا نہیں کی کہ جناب اخگر رموز شاعری کے ساتھ ساتھ عروض میں بھی مہارت حاصل کر سکتے لیکن جتنا بھی وہ اکتساب کر سکے وہ ایک شاعر کے شعری سفر میں گُمراہی سے بچانے کے لیے کافی ہے۔

جناب اخگر کے کلام میں جن نمائندہ شعراء کی واضح پرچھائیاں ملتی ہیں ان میں جہاں حضرت صفی اورنگ آبادی کے زبان و بیان کی پرچھائیں ملتی ہیں وہاں

خود حضرت غلام علی حاوی کے انداز فکر کی پرچھائیں ملتی ہے لیکن اس احتیاط و عمدگی کے ساتھ کہ اس پر چربہ سازی کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ استفادہ و استخراج کی تعریف صادق آتی ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے میری رائے کی تصدیق کی جا سکتی ہے ؎

جس کو شوق دید نے اندھا کیا
ہائے تم نے اس سے کبھی پردا کیا

جس نے دی تھی جان دے ڈالی اُسے
عمر بھر میں کام اک اچھا کیا

موت ہے پیغام وصل یار مگر
خوش نہیں کوئی بھی اس پیغام سے

ہر کسی کو تم نظر آجاؤ گے
اس طرح نیچے نہ جھانکو بام سے

داور محشر کے عکس نور سے
عاصیوں کے منہ پہ بھی کیا نور ہے

مرے غمخوار اسی کو پوچھتے ہیں!!
نہیں جو بات کہنے کی کسی سے

کرن پھوٹی حرا سے ایسی اخگر
نکل آیا زمانہ تیرگی سے

ایسے پیغام اور اس کے لانے والے کے نثار
نقشۂ دنیا بدل ڈالا ہے اک پیغام سے

عجب ہیں یہ مقدر کی شکایت کرنے والے بھی
کبھی اتنا نہ سمجھے کس پہ یہ الزام آتا ہے

راستے سارے کھلے ہیں مسکنِ جبریل تک
ہاں مگر جو راستہ آگے ہے وہ مسدود ہے

اک ذرا تصویر لے لوں آپ کی
یوں ہی لگ کر بیٹھیے دیوار سے

غیر مطمئن ہیں وہ غیر کی صفائی سے
بات کٹ گئی اس کی لاج رہ گئی اپنی

وقت جب ہم نوا نہیں ہوتا
آشنا آشنا نہیں ہوتا

کریں یہ وعدہ کہ وعدہ نہیں بھلائیں گے
وگرنہ آپ کو عادت ہے بھول جانے کی

زمانے پہ نہیں کھلتا فصاحت کس کو کہتے ہیں
زباں میں اُس کی اس کا ذکر قرآں نہیں ہوتا

الٰہی ایسا محبّت میں انقلاب آئے
اُدھر کا حال بھی ہو جائے کچھ اِدھر کی طرح

آپ کو معلوم ہے اخگر ہوں میں
دوسروں کی آگ میں جلتا نہیں

ایک ہم ہی طالبِ دُنیا نہیں
اس طلب سے کوئی مستثنیٰ نہیں

مجھ پہ احسان یہ کیجے کہ نہ کیجے احساں
سخت شرمندہ ہوں میں آپ کے احسانوں سے

نہیں ہے ہاتھ اگر بقدر کے نیچے
اٹھاؤ تو ذرا سر آستاں سے

دیکھ کر اخگر کو فرمانے لگے
آگ لگ جاتی ہے اس کے نام سے

نظیر علی عدیلؔ
بیت النظیر ۱۹۰-۲-۲۳
منلپورہ حیدرآباد ۲۰۰۰۰۵

اپنے بارے میں!

حیدرآباد دکن قدیم ہی سے شعر وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ باکمال شاعر و ادیب اور علماء خاک دکن سے اُٹھے اور پھر شاہان دکن کی علمی قدردانیوں اور فیاضانہ سرپرستیوں کی بدولت صاحبان فضل و کمال اور شعراء ہندوستان کے چپہ چپہ سے کھنچ کر یہاں آتے اور رہ بس گئے۔ اس طرح حیدرآباد علوم و فنون اور مختلف مکاتیب فکر کی حامل شخصیتوں کا مرکز بن گیا۔ شعراء کی سخن طرازیوں سے شعر وادب کی محفلیں آراستہ تھیں۔ طرحی اور غیر طرحی مشاعرے تہذیب اور معاشرت کا جُز بن گئے۔ جب میں سنِ شعور کو پہنچا تو ان محفلوں کی رونقیں منور و تابندہ تھیں۔

شاعری کا مجھے فطری ذوق ہے۔ اسی شاعرانہ ماحول نے مجھے شعر کہنے پر مائل کر دیا۔ اس دور میں استاد سے اصلاح لینے کی قدیم روایت باقی و جاری تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے حسبِ روایت حضرت فصیح الدین مہرؔ اور ان کے انتقال کے بعد حضرت میر محمد علی نقیرؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شہر حیدرآباد میں استاد سخن حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی دھوم تھی اور گلی گلی چرچا تھا۔ خوش قسمتی سے حضرت کو دیکھنے اور آپ کی زبانی کلام سننے کی سعادت ملی لیکن خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرنے سے محروم رہا۔ البتہ اس محرومی کا ازالہ یوں ہوا کہ حضرت صفیؔ کے جانشین حضرت غلام علی حاویؔ جیسے کامل الفن استاد کا شرف تلمذ ملا۔ جب میں نے

حاضر ہوکر کلام پر اصلاح دینے کی خواہش اور گزارش کی تو بڑی خوشی اور شفقت
سے حضرت حاوی نے شرف قبولیت بخشا۔ حضرت صفی کے انتقال کے بعد
آپ کی قائم کردہ "بزم تلامذہ صفی" باقی و قائم رہی۔ اس بزم کی جانب سے
ماہانہ طرحی مشاعرے منعقد ہونے کی روایت جاری تھی۔ ان مشاعروں
میں دیگر شعراء کے علاوہ شاگردان صفی بڑے ذوق و شوق اور پابندی سے
حصہ لیتے تھے ایک تو حضرت حاوی کا فیض صحبت دوسرے ان مشاعروں
میں شرکت نے میرے ذوق شعری کو اُبھارا۔ اس طرح طبع آزمائی اور مشقِ
سخن جاری رہی۔ میری کئی غزلیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ بعد میں "بزم تلامذہ صفی"
کی معتمدی کے فرائض سات سال تک انجام دینے کا اعزاز بھی ملا جس کی وجہ
سے شاگردان صفی سے مخلصانہ روابط استوار ہوئے۔

ملازمت کی مستقل ترقی سے میرا تبادلہ ضلع پر ہوگیا اور پھر ایک ضلع سے
دوسرے ضلع کی گردش مقدر بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشق سخن چھوٹ گئی اور
شاعری کی ترکی تمام ہوگئی۔ جب سنہ ۱۹۸۳ء میں مجھے قید ملازمت سے رہائی
ملی تو "بےکار مباش کچھ تو کیا کر" کے مصداق شاعری کی سوجھی جس کی چنگاریاں
نہاں خانۂ دل میں بجھی بجھی سی باقی تھیں۔ حیدرآباد انقلاب سے دوچار رہا۔
زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں آئیں لیکن عجیب بات ہے کہ یہاں کی تہذیبی
اور شعری و ادبی روایات جوں کی توں برقرار رہیں۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں کی
رونقیں اس طرح تابندہ کی تابندہ رہیں بلکہ ان انجمنوں کی کثرت پہلے کی بہ نسبت
زیادہ ہی نظر آتی ہے میرے دوست استادِ سخن جناب سید نظیر علی عدیل سے
میرے مخلصانہ مراسم ہیں ان کی معیت اور سنگت میں اکثر و بیشتر مشاعروں میں
شرکت کے مواقع ملتے رہے اور ان کی حوصلہ افزائی سے ان مشاعروں میں کلام
سنانے کی راہیں ہموار ہوئیں چنانچہ "ادارۂ اسلامی ادب" اور "بزم جوہر"
کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوکر شعرائے کرام کی غزل سرائی سے محظوظ
ہونے اور کچھ اپنی سنانے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔

شاعری میں غزل گوئی میری پسندیدہ صنف ہے۔ تا بہ حد بساط اس صنف سخن کو اختیار کیا اور مشق سخن بہم پہنچائی۔ میری شاعری ترقی پسندانہ نہیں ہے نئے رجحانات اور نیت نئے نظریات کا میں نے تجربہ کیا نہ پرچار۔ یہ شاعری دبستان صفی کی رہین منت ہے۔ جذبات عشق و محبت اور تجربات زندگی کا زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ اظہار، ندرت خیال اور بول چال۔ محاورے ضرب الامثال اور تلمیحات کا برموقع استعمال۔ میری شاعری ان ہی لوازمات کے تانے بانے سے مربوط ہے۔

اپنے کلام کے ساتھ میں نے بے اعتنائی نہیں برتی۔ جو کچھ بھی لکھا سنبھال کر رکھا اس طرح سابقہ اور حالیہ تخلیقات شعری کا معتد بہ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ میری ذہنی کاوشیں پسند خاطر احباب ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ میری متاع عزیز ہیں کہ "جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے ہم نے پالے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری میں نے محسوس کی طباعت کے بارگراں کے پیش نظر انتخاب کلام ناگزیر تھا۔ اس لیئے غزلیات کی اشاعت پر اکتفا کرنا پڑا۔

وظیفہ کے بعد جناب سید نظر علی عدیل اور جناب محمد نورالدین خاں جیسے ادیب و محقق کی زیادہ صحبتیں میسّر رہیں۔ ان اصحاب کی ہمت افزائی اور رہنمائی تھی کہ نثری کام کرنے راغب ہوا۔ چنانچہ ایک جامع تذکرہ "تلامذہ صفی اورنگ آبادی" سنہ ۱۹۹۱ء میں اور "اصلاحات صفی اورنگ آبادی" سنہ ۱۹۹۳ء میں مُرتب و شائع ہوئے۔ یہ بات میرے لیئے بڑی حوصلہ افزا ہی کہ اہل علم اصحاب نے میرے علمی و تحقیقی کام کو سراہا اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں جن اصحاب نے تعاون کیا ان کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ اس لیئے سب سے پہلے میرے دوست سیّد نظر علی عدیل اور جناب محمد نورالدین خاں کا مشکور ہوں کہ ہر مرحلہ پر مفید مشوروں سے نوازا۔ جناب عبدالرؤف صاحب خوشنویس نے بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے کتابت کا فرض انجام دیا۔ اور جناب ولی محمد صاحب آرٹسٹ نے ٹائیٹل کو اپنے

نوک قلم سے جاذب نظر بنایا۔ میں ان دونوں فنکاروں کا ممنون ہوں۔
کارپردازان دائرہ پریس اور حفیظیہ بک بائنڈنگ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ بڑی دلچسپی اور مستعدی سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی اور اس کے صدرنشین جناب رحمت علی صاحب کے لیے اظہار تشکر نہ کروں کہ جزوی رقمی امداد طباعت کے لیے منظور کرکے نہ صرف قدردانی کی بلکہ یہ رقمی امداد کتاب کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوئی۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

محبوب علی خاں اخگر قادری

نصیب منیشن ۲/۱۷/۲۶۲-۳-۱۹
جہاں نما۔ حیدرآباد ۵۰۰۲۵۳

۷۸۶
۹۲

حمدِ باری تعالیٰ

جہاں تک نگاہوں میں ارض و سما ہے
وہاں تک خدا ہے خدا ہی خدا ہے

ہر اک چیز فانی ہے لازم فنا ہے
فقط اک خدا ہے کہ جس کو بقا ہے

ازل سے دلِ انساں کا حق آشنا ہے
جو دھڑکن بھی ہے اس میں ھُو کی صدا ہے

اُسے دیکھنے طور پر جائیں ہم کیوں
نظر ہو تو ہر شے میں جلوہ نما ہے

بیاں ہو سکیں جو ہیں اوصاف اس کے
وہ خود عقل سے ماورا ماورا ہے

وہ اول وہ آخر وہ ظاہر وہ باطن
اسی واسطے اس کو سجدہ روا ہے

ہو کیسی ہی مشکل پکارا اسی کو اخترؔ
بجز اس کے کون اور مشکل کشا ہے

حمدِ باری تعالیٰ

ناتواں آنکھ سے حیرت ہے کہ کیا کیا دیکھا
ذرّے ذرّے میں الٰہی ترا جلوہ دیکھا

ہم کو جس حال میں رکھا ہے اسی میں خوش ہیں
جب سے مرضی تری دیکھی ترا منشا دیکھا

پڑھ کے کلمہ ترا ہوتا ہے سویرا شاید
اس کے چہرے سے عجب نور نکھرتا دیکھا

ہے تعجب کہ بنائے ہیں دو عالم تو نے
اور خود عرشِ بریں پر تجھے تنہا دیکھا

ہو ثبوت اور ابھی کیا تری یکتائی کا
تیرے ہر نقش کو اپنی جگہ یکتا دیکھا

مانگتا آیا یہاں ایک زمانہ جس سے
اس کو بھی در سے ترے مانگنے والا دیکھا

چاہے شداد ہو، نمرود ہو یا ہو فرعون
نہ بچا کوئی بھی ہر ایک نے نیچا دیکھا

وہ اگر چاہے تو دوبارہ جوانی دے دے
اس کی تصدیق میں انسان بچا دیکھا

نور میں نار کا عنصر نہیں ہوتا اے خدا گر
ایک دنیا نے مگر طور کو جلتا دیکھا

حمد باری تعالیٰ

سر بہ سجدہ ہے جو در پر اس کے
سب ہی پیرو ہیں سراسر اس کے

ہے جو اس کا، ہیں مقدر اس کے
خوشہ چیں سارے نظر ور اس کے

ساز دیتی ہے ہوا لہرا کر
گیت گاتے ہیں سمندر اس کے

ظاہر اس کا ہے اسی کا باطن
منظر اس کے پس منظر اس کے

جتنی قومیں ہیں زمانے بھر میں
سب میں آئے ہیں پیمبر اس کے

غیر ممکن ہے گننا ان کا
جتنے احسان ہیں ہم پر اس کے

رات دن ہوتی ہے کار اجرائی
بند ہوتے نہیں دفتر اس کے

جانِ عالم ہے وہی دِل گو یا
نقش احکام ہیں جس پر اس کے

اک نقطہ طور پہ کیا ہے موقوف
جلوے ہر جا ہیں اُجاگر اس کے

کھولتا ہے وہ زباں کب اپنی
راز کھُل جاتے ہیں جس پر اس کے

جس کے جلوے ہیں ہر اک جا اخگرؔ
صدقے اس کے میں نچھاور اس کے

نعت شریف

"کیا جانتے ہیں اہلِ خرد کیا ہیں مصطفےٰ
تخلیق کائنات کا منشا ہیں مصطفےٰ

اے طالبانِ حُسنِ ازل اُن کو دیکھ لو
شکلِ بشر میں اُس کا سراپا ہیں مصطفےٰ

دو ایسی ہستیاں ہیں کہ جن کو فنا نہیں
پروردگار پاک ہے خود یا ہیں مصطفےٰ

اِس واسطے بھی ہے شبِ اسریٰ کی اہمیت
مہماں عرش پر شبِ اسریٰ ہیں مصطفےٰ

سعدی نے سچ کہا ہے کوئی اس میں شک نہیں
بعد از خدا بزرگ ہیں اعلیٰ ہیں مصطفےٰ

مایوس ہو نہ کوئی غموں کے علاج سے
شافی خدا ہے اور مسیحا ہیں مصطفےٰ

سایہ رہے گا سب پہ قیامت میں آپ کا
بے سایہ ہیں یہاں، وہاں سایا ہیں مصطفےٰ

دُنیا بنا کے اُس نے سجائی ہے انجمن
اس انجمن میں انجمن آرا ہیں مصطفےٰ

اخگر پکار اٹھیں تو سنور جائے گا نصیب
دونوں جہاں کے مالک و آقا ہیں مصطفےٰ

نعت شریف



جب کبھی دیدار مصطفیٰؐ ہوگا
دن وہ میرے لیے بڑا ہوگا

جو یہاں دشمن آپؐ کا ہوگا
وہاں قدموں میں لوٹتا ہوگا

درِ تاثیر کھل گیا جس سے
وہ مرا نالۂ رسا ہوگا

جس کو لگ جائے ان کے غم کا مزہ
کس لیئے طالبِ شفا ہوگا

پشت چومے گا ایک اعرابی
وہم میں بھی نہ آسکا ہوگا

جس سے راضی مرے نبیؐ ہوں گے
اس سے راضی مرا خدا ہوگا

روز محشر خدا کا ہر بندہ
منتظر صرف آپؐ کا ہوگا

شوقِ دیدار ہی سے بیخود ہوں
دیکھ لوں تو نہ جانے کیا ہوگا

آپ مختارِ کُل ہیں ہم محتاج
یہی محشر میں دیکھنا ہوگا

اس کی بخشش میں شک نہیں کوئی
ربط جس سے حضورؐ کا ہوگا

لوٹے رُوح الامین جب اخگر
دِل یہیں ان کا رہ گیا ہوگا

نعتِ سرورِ کونینؐ

اپنے دل کا مرے اللہ یہ رُتبہ دیکھوں
رات دن عشقِ محمدؐ میں تڑپتا دیکھوں

جب کبھی سرکارؐ کا میں نقشِ کفِ پا دیکھوں
اپنی نظروں کو سرِ عرشِ معلّٰی دیکھوں

کاش نظروں پہ یہ احسان خُدا کا ہو جائے
جس طرف آنکھ اُٹھے جلوہ نبیؐ کا دیکھوں

آرزو سب کو رہے دیدِ رُخِ انور کی
دل میں ہر اک کے یہی داغِ تمنّا دیکھوں

ہیں جو اللہ کے محبوب، نظر ہے ان پر
اب کسی اور کی جانب میں بھلا کیا دیکھوں

ان کے روضے کو تو دیکھا ہے کئی بار مگر
آرزو ہے کہ نبیؐ کا رُخِ زیبا دیکھوں

شُکر ہے کہتی ہے مجھ سے مری قسمت اخگر
آگ میں عشقِ نبیؐ کی تجھے جلتا دیکھوں

منقبت غوث اعظم رضؑ

آپ کے جتنے فداکار ہیں غوث الثقلین
رحمتِ حق کے وہ حق دار ہیں غوث الثقلین

اہلِ اسلام کے سردار ہیں غوث الثقلین
نائبِ سیّدِ ابرار ہیں غوث الثقلین

چشمِ حق بیں ہے مقدر سے میسّر جن کو
آپ کے طالب دیدار ہیں غوث الثقلین!

پرتوِ نورِ محمّدؐ ہیں ازل کے دن سے
سر بسر مطلعِ انوار ہیں غوث الثقلین!

سانس تک لے نہ سکے گروہ مقابل آئے
کُفر کے حق میں وہ تلوار ہیں غوث الثقلین

ہے کرم آپ کے در سے ہی کرم فرمائیں
ہم مصیبت میں گرفتار ہیں غوث الثقلین

فکرِ عقبیٰ، غمِ دُنیا ہو مجھے کیوں! خسؔگر
میرے مالک مرے مختار ہیں غوث الثقلین

کوئی کیا جانے حقیقت غوث کی
دو جہاں پر ہے حکومت غوث کی

عبد قادر آپ کا ہے اسمِ پاک
قُدرتِ قادر ہے قدرت غوث کی

دین و دُنیا میں وہ ہوگا سرفراز
جس کے دل میں ہو محبت غوث کی

وہ اِطاعت ہے خُدا کی دوستو
جو کرے دل سے اِطاعت غوث کی

اولیاء اللہ کے سُلطان ہیں
کس نے پائی ایسی عظمت غوث کی

اپنے نانا کی ہیں سرتا پا مثال!
دیکھو صورت اور سیرت غوث کی

بس ہے اخگر دونوں عالم میں مجھے
آستانِ عارف کا، نسبت غوث کی

منقبت خواجہ غریبؒ نواز

شانِ ربّ العلا غریبؒ نواز
نورِ خیر الوریٰ غریبؒ نواز

جانِ مشکل کشا غریبؒ نواز
مظہرِ مرتضیٰ غریبؒ نواز

دوسرا ہیں نوازنے کو مجھے
کون ہے دوسرا غریبؒ نواز

سِرِّ باطن ہے گنجِ مخفی ہے
چہرۂ باصفا غریبؒ نواز

کعبۂ ہند کیوں نہ ہو روضہ
تم ہو ظلِّ خدا غریبؒ نواز

ہو رہی ہے مری خودی حائل
اس کو روکو ذرا غریبؒ نواز

پاس اپنے بلا کے اخگر کو
دیجیے آسرا غریبؒ نواز

غزلیات



جس کو شوقِ دید نے اندھا کیا
ہائے تم نے اس سے بھی پردا کیا

کیا نہ ہوتا اور کچھ کہتا اگر
جس نے لفظِ کن سے سب پیدا کیا

ہو گئے محفل میں جب وہ بے حجاب
ہم نے ہی شرما کے خود پردا کیا

لا کے رکھ دی ہے قفس میں شاخِ گُل
زخم پھر صیاد نے تازہ کیا

غم میں ہنسنے پر مرے وہ خوش نہیں
میں نے تو معیارِ غم اونچا کیا

جب سمجھ میں آئے معنی صبر کے
ہر نئے غم پہ نیا سجدا کیا

رونے والے نے فراقِ دوست میں
آنسوؤں کا مصرفِ بے جا کیا

دیں صدائیں چیخ کر ہمتوں نے
در کسی نے بھی نہ اپنا وا کیا

دے دیا دل اک جھلک ہی دیکھ کر
ہم نے یہ سودا بہت مہنگا کیا

جس نے دی تھی جان دے ڈالی اُسے
عُمر بھر میں کام اک اچھا کیا

کر لیا میں نے یقیں منہ دیکھ کر
اس نے آخر گر جب کوئی وعدا کیا



دو شعر

خواب احساس ہے وہ جس کو قضا کہتے ہیں
زندگی نام ہے احساس کی بیداری کا

رکھے جس حال میں اللہ مجھے میں خوش ہوں
امتحاں آپ نہ لیجے مری خود داری کا



اس نے دل رکھنے کو بس اتنا کیا
وعدہ پورا کرنے کا وعدا کیا

دردِ دل اور اک نیا پیدا کیا
اے مسیحا تو نے یہ اچھا کیا

وہ تمہارے ملنے والوں میں سے ہے
جس نے تم کو جا بجا رسوا کیا

ڈھک لیا دیوانگی کا پیرہن
اس طرح سے راز کا اخفا کیا

آنکھ والوں سے کہاں وہ چھپ سکا
سات پردوں میں بھی گر پردا کیا

گردشِ دوراں نہ ہو کیوں دم بخود
اس نے ہر امروز کو فردا کیا

اے جنونِ عاشقی پائندہ باد
حسن سے بھی دل کو بے پروا کیا

مُنہ ہی کیا ہے غم کے آگے حشر کا
حشر اس نے روز اک برپا کیا

تھا ہی کیا پہلے بجز گرد و غبار
قیس نے صحرا کو کچھ صحرا کیا

کیا خبر کیا ہے خدا کی مصلحت
ہم کو ظاہر کر کے خود پردا کیا

مُڑ کے بھی دیکھا نہ میری عُمر نے
مَیں نے آخر دُور تک پیچھا کیا



دو شعر

ہیں گرنے والی کہاں بجلیاں نہیں معلوم
ہے کس کا بیشِ نظر آستاں نہیں معلوم

ہم بچاتے ہوئے دامن کو رہے دُنیا میں
جن کو رہنا تھا تہہِ دام تہہِ دام رہے



جو ہے تسکینِ جاں کا ذکر کیا
کیجیے اس مہرباں کا ذکر کیا

عکس ان کے حسن کا جس میں نہ ہو
اس بہارِ گلستاں کا ذکر کیا

اپنی کشتی کا خدا ہے ناخدا
پھر ہوا کا، بادباں کا ذکر کیا

دھوپ میں دامن ترا یاد آ گیا
اب کسی بھی سائباں کا ذکر کیا

ہم نہیں خود آپ اپنے ہمسفر
ہم رکاب و ہم زباں کا ذکر کیا

ہے پشیمانی خود ان کی آنکھ میں
اب کسی دردِ نہاں کا ذکر کیا

طرزِ اظہارِ صفی کو چھوڑ کر
ہو سکے حسنِ بیاں کا ذکر کیا

شیخ صاحب بھی ہیں رُکنِ میکدہ
رند کا، پیرِ مغاں کا ذکر کیا

قابلِ اظہار ہی یہ شے نہیں
لذتِ دردِ نہاں کا ذکر کیا

رہ گئے ہیں بن کے نقشِ جبیں
ان کے قدموں کے نشاں کا ذکر کیا

جن کے زیرِ پا ہیں ساتوں آسماں
ان کے آگے آسماں کا ذکر کیا

ہو رہا ہے پھر کسی کی بزم میں
اخگرِ شعلہ بجاں کا ذکر کیا



اس کی نظروں کا انتخاب ہوا
میری قسمت میں کامیاب ہوا

وجہِ تسکین اضطراب ہوا
دل محبّت میں کامیاب ہوا

بس وہی شخص کامیاب ہوا
جو ترے عشق میں خراب ہوا

شیخ صاحب کو بھی ملے ساغر
کیا غلط مصرفِ شراب ہوا

سُننا اور سُن کے مُسکرا دینا
کیا مری بات کا جواب ہوا

خوب سے خوب تر گلاب سہی
اس کے عارض کا کب جواب ہوا

اس کی مرضی تھی ہو گیا ناکام
دل مرا یوں بھی کامیاب ہوا

دیکھتے رہتے تھے خوشی کے خواب
وہ زمانہ ہمارا خواب ہوا

ہائے جل جل کے آتشِ غم میں
اخترِ خستہ اب کباب ہوا



دِل جو غم آشنا نہیں ہوتا
حق اُلفت ادا نہیں ہوتا

وقت جب ہم نوا نہیں ہوتا
آشنا آشنا نہیں ہوتا

نظر آتا نہ کوئی حاجت مند
گر وہ حاجت روا نہیں ہوتا

دِل کی قیمت نہ ہوتی دُنیا میں
گر کوئی دِل رُبا نہیں ہوتا

گھونٹ ڈالا ہے ضبط نے ورنہ
دردِ دل کیا سے کیا نہیں ہوتا

مشکلیں اور سخت ہوتی ہیں
جب کوئی ہم نوا نہیں ہوتا

دل کو ملتا نہیں سکون اخگر
درد جب تک سوا نہیں ہوتا

کسی عنواں شریکِ حلقۂ رنداں نہیں ہوتا
اگر اللہ کی رحمت پہ مرا ایماں نہیں ہوتا

وہ دل جس میں تمہاری یاد کی پرچھائی رہتی ہے
اکیلا ہو بھی سکتا ہے مگر ویراں نہیں ہوتا

قسم اللہ کی ہم چلتی پھرتی لاش بن جاتے
اگر دل میں ہمارے آپ کا ارماں نہیں ہوتا

خزاں کی چیرہ دستی سے چمن ویراں تو ہوتا ہے
نشیمن کے اُجڑنے سے چمن ویراں نہیں ہوتا

مری ہمت جہاں پتوار بن جاتی ہے کشتی کی
وہاں میرے مقابل کوئی بھی طوفاں نہیں ہوتا

جو سائل ان کا ہے اسکی نرالی شان ہوتی ہے
تہی داماں بھی رہ کر بے سر و ساماں نہیں ہوتا

جو تم پر مر نہیں سکتا وہ زندہ رہ نہیں سکتا
جو تم پر جان دیتا ہے کبھی بے جاں نہیں ہوتا

زمانے پر نہیں کھلتا فصاحت کس کو کہتے ہیں
زباں میں اُمّی کی اس کا اگر قرآں نہیں ہوتا

وہ قطرہ کچھ نہیں جو پھیل کر دریا نہ بن جائے
وہ اخگر کیا جو بڑھ کر شعلہ عُریاں نہیں ہوتا



ہوتے ہوتے حُسن کا جب ان کے چرچا ہو گیا
پھر تو کیا تھا سارا عالم ان کا شیدا ہو گیا

لیجیئے بیمارِ غم دُنیا سے چلتا ہو گیا
آپ نے چاہا تھا جیسا آج ویسا ہو گیا

مَیں ہوا برباد تو افسوس کیوں ہے آپ کو
بندہ پرور آپ کا منشا تو پورا ہو گیا

دید میں بے احتیاطی اک ذرا کیا ہو گئی
پیار میں رازِ محبت آشکارا ہو گیا

یہ کرم کس کا ہے یہ کس کی عنایت ہے حضور
مَیں زمانے بھر میں جو بدنام و رُسوا ہو گیا

کہہ نہیں سکتے کہ آئندہ ہے کیا تقدیر میں
دوست کے غم پر ابھی تک تو گزارا ہو گیا

حُسن میں ہوتا ہے مقناطیس کا اکثر اثر
جو ملا اک بار اس سے بس اسی کا ہو گیا



انقلاب آیا تو یہ کیسا تماشا ہو گیا
کس کا حلیہ کیسا بدلا، کون کیسا ہو گیا

جب مکمل خاک سے انساں کا خاکا ہو گیا
اس کی تخلیقات میں شہکارِ اعلیٰ ہو گیا

جو غمِ محبوب میں معدومِ دُنیا ہو گیا
وہ مریض اچھا نہیں ہو کر بھی اچھا ہو گیا

زندگی کا ایک اک پہلو ہے جب ناخوشگوار
پھر خوشی سے زندہ رہنا کیوں گوارا ہو گیا

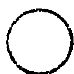
لے یہ آئینہ ہے اپنی بولتی آنکھوں سے پوچھ
شہر بھر میں کیوں مرے غم کا پُکارا ہو گیا

ان کے الطاف و کرم نے ہوش میرے کھو دیئے
وہ ہوئے میرے تو میں اپنے سے پرایا ہو گیا

رُکتے رُکتے فرطِ غم میں اس کی نبضیں رک گئیں
ہوتے ہوتے آپ کا بیمار اچھا ہو گیا

ان کے قدموں سے ملے ہیں سربلندی کے نشاں
جو جُھکا قدموں پہ ان کے سب سے اُونچا ہو گیا

میرے ضبطِ غم پہ وہ بھی گفتگو کرنے لگے
میری خاموشی کا آخر بول بالا ہو گیا



موسمِ گُل بار بار آتا رہا
ہاں مگر مجھ سے ہی کتراتا رہا

کچھ نہیں تھا جس میں اس کی دھوم تھی
جس میں جوہر تھا وہ شرماتا رہا

دشمن اُس کی ہر زمانے کی ہوا
روشنی جو کوئی پھیلاتا رہا

کل پہ اپنی ہر بلا کو ٹال کر
اپنی اُلجھن کو مَیں سُلجھاتا رہا

علم کی تشہیر کا تو نام تھا
اپنی لاعلمی کو پھیلاتا رہا

سو رہا ہوں کِتنی بے فکری سے مَیں
موت سے بے وجہ گھبراتا رہا

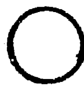
حشر میں زاہد کو تھی فکرِ جزا
مَیں کرم پہ اُس کے اِتراتا رہا

وصل کی شب ہم بھی شرماتے رہے
اور وہ ظالم بھی شرماتا رہا

حادثے خود راستے سے ہٹ گئے
اس قدر میں ان سے ٹکراتا رہا

کیوں زمانہ لاتا خاطر میں ہمیں
جس کا کھایا اس کی وہ گاتا رہا

یہ بھی اختر اک سزائے جرم تھی
جرم کرنے والا پچھتاتا رہا



دو شعر

دن چڑھے اُن کو نیند آئی ہے
زخم جاگے تھے رات بھر کے لیے

گناہوں پہ حاصل ہے قدرت مجھے
ہے کچھ میری نسبت بھی قدرت کے ساتھ

خوشی سے میں ہر غم اُٹھاتا رہا
مصائب میں بھی مسکراتا رہا

نئے آشیانے بناتا رہا
میں دل بجلیوں کا بڑھاتا رہا

مری زندگی اب عبث کیوں نہ ہو
سہارا ترے غم کا جاتا رہا

کشش تھی گناہوں میں بے شک بہت
مگر ان سے دامن بچاتا رہا

خلش اس کے دل میں بھی پیدا ہوئی
ہمیشہ جو کانٹے چبھاتا رہا

مجھے دیکھ کر غیر جلتے رہے
میں شمعِ محبّت جلاتا رہا

شب غم ہوا خواہ تھا اک چراغ
سرہانے مرے جھلملاتا رہا

وہ اک تم کہ آنکھیں چُراتے رہے
وہ اک میں کہ آنکھیں بچھاتا رہا

بھروسہ تھا جس دل پہ آخر مجھے
وہی میرے پہلو سے جاتا رہا



وہ مٹاتے ہیں نقش پا اپنا
یا دکھاتے ہیں راستا اپنا

اب ہمارے قدم نہیں اُٹھتے
کارواں اب نئے راستا اپنا

تم مرے ساتھ چل نہیں سکتے
کیوں نہ بدلوں میں راستا اپنا

وہ ذرا آ گئے جو رستے پر
چھُٹ گیا ہم سے راستا اپنا

کوئی آنکھیں بچھائے یا کانٹے
ہم بدلتے ہیں راستا اپنا

آپ غیروں کی رہبری کیجے
جانتا ہوں میں راستا اپنا

دوڑتا کیوں ہے چل سکون سے چل
منزل اپنی ہے راستا اپنا

نہیں دیکھتے زمین کے بھوڑے
دیکھ کر چلئے راستا اپنا

ہم ہی بن بیٹھے راہ کا پتھر
ورنہ تھا صاف راستا اپنا

راہ بر کس خیالِ خام میں ہے
ہم بنالیں گے راستا اپنا

یہی رفتار ہے اگر اختر
بھول جاؤ گے راستا اپنا



بُتوں سے عشق تو کر دل کو بُت کدہ نہ بنا
خُدا کے گھر کو خُدارا حرم سرا نہ بنا

جمالِ فن میں دکھا خود کو خود نما نہ بنا
اَنا کو رہنے دے شرمیلی بے حیا نہ بنا

بڑا ہوا کہ بھی انسان پھر بھی بندہ ہے
بڑا بناتے بناتے اسے خُدا نہ بنا

نہیں ہے کوئی بھی واقفِ طلب کی منزل سے
رہِ طلب میں کسی کو بھی رہنما نہ بنا

ازل میں کتنے ہی پیکر نہیں بنائے گئے
مگر کوئی بجُز آدمؑ غم آشنا نہ بنا

کبھی نہ ہوگا پشیماں وہ دل ہی دل میں سہی
بہانہ ساز سے ایسا کوئی بہانہ بنا

فنا ہوئی ہے جہاں گر کے برق اے اخگر
اسی مقام پہ اک اور آشیانہ بنا



زمانے میں اگرچہ اک سے اک بڑھ کر حسیں پایا
کوئی تم سا نہیں دیکھا کوئی تم سا نہیں پایا

محبّت کرنے والے پر ہے کیوں الزام محرومی
یہ کیا کم ہے کہ چشم نم ملی قلب حزیں پایا

نہیں معلوم کیا کیا ہے جناب شیخ کے دل میں
مگر اتنا تو ہے چہرہ بہت زہد آفریں پایا

خلوص فہم کے پردے میں تھی ناتجربہ کاری
جسے سمجھا تھا اپنا اس کو مار آستیں پایا

زمانے کو خیال آیا ہے میری سجدہ ریزی کا
جہاں نقش کفِ پا یار کوئی نقش جبیں پایا

نہاں ہے بے ثباتی گردش ایام میں اختر
جو کل رُوئے زمیں پر تھے انھیں زیرِ زمیں پایا

نگاہِ شوق سے جس نے بھی سُوئے آستاں دیکھا
زمیں پر آسماں سے خوبصورت آسماں دیکھا

مقامات اس جہاں سے اس جہاں تک سب نظر میں ہیں
ذرا ٹھہرو بتاتا ہوں تمہیں میں نے کہاں دیکھا

تصور میں جمالِ یار قائم ہو تو کیسے ہو
کبھی کچھ کچھ نہاں دیکھا کبھی کچھ کچھ عیاں دیکھا

بس اتنا فرق ہے موسیٰ ہماری دید بازی میں
جسے تم نے وہاں دیکھا اسے ہم نے یہاں دیکھا

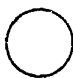
زمیں پر آج بھی بستے ہیں اربابِ نظر ایسے
جنھوں نے جب بھی چاہا ماورائے آسماں دیکھا

جسے ڈھونڈا تھا میں نے دو جہاں کے گوشے گوشے میں
کھُلی جب آنکھ تو اس کو قریبِ قلب جاں دیکھا

مری نظروں میں تھا جو خلد کا موہوم سا نقشہ
وہ گہرا ہو گیا جب سے تمہارا آستاں دیکھا

تمہاری جلوہ آرائی تھی یا کوئی نظر بندی
نظر آئے تمہیں مجھ کو جدھر دیکھا جہاں دیکھا

خودی کے دور میں جو ہر گماں سے دُور تھا اخگر
اسی کو بے خودی کے دور میں حسبِ گماں دیکھا



عارضِ حسن پہ زلفوں کو بکھرتے دیکھا
صبح کو شام کے پہلو میں ٹھہرتے دیکھا

ہجر کے زخم الگ ہوتے ہیں سب زخموں سے
زندگی بھر نہ کسی زخم کو بھرتے دیکھا

جن سے امید تھی مشکل میں رہیں گے بازو
ان کو منہ پھیر کے بازو سے گزرتے دیکھا

موسمِ گل کی خوشی کس کو نہیں گلشن میں
پھول تو پھول ہیں، کانٹوں کو سنورتے دیکھا

ہائے وہ لوگ جو کرتے رہے دنیا سازی
ایک دن ان کو بھی دنیا سے گزرتے دیکھا

یوں تو مرنے کا یقیں کس کو نہیں ہے لیکن
موت کے نام سے ہر ایک کو ڈرتے دیکھا

ایک سورج اگر امید کا ڈوبا اخگر
ساتھ ہی اک نئے سورج کو ابھرتے دیکھا

سرحدِ غم سے آگے جا نہ سکا
مَیں خوشی میں بھی مسکرا نہ سکا

نامرادی سی نامرادی ہے
خود کو کھو کر بھی اُن کو پا نہ سکا

میرے اک دل کو چھوڑ کر کوئی
دونوں عالم میں بھی سما نہ سکا

گُم ہوا برق کے اُجالے میں
آشیانے کو مَیں بچا نہ سکا

مَیں کہوں اس کو دوست کس منہ سے
جو مصیبت میں کام آ نہ سکا

رہ کے اک عمر اُس کے پہلو میں
خارِ گُل کا مقام پا نہ سکا

اس نے ایسا لگایا باتوں میں
حالِ دِل اپنا مَیں سُنا نہ سکا

ہائے کیسا غیور تھا ابلیس
غیر کے آگے سر جُھکا نہ سکا

کیا ہے آخر عدم میں اے اخگر
جو گیا لوٹ کر پھر آ نہ سکا



وہ جب سے نظر میں سمانے لگا
مزہ زندگانی میں آنے لگا

جسے غم سے فرصت نہ تھی عشق میں
بہ فیضِ جنوں مسکرانے لگا

ہزاروں میں آیا ہے دل آپ پر
بڑی مشکلوں سے ٹھکانے لگا

سویرے سویرے ہے کیسی تھکن
پسینہ سا پھولوں کو آنے لگا

جہاں بھی ملے تیرے نقشِ قدم
زمانہ وہاں سر جھکانے لگا

یہ میری تباہی کی توہین ہے
ترس دشمنوں کو بھی آنے لگا

غنیمت ہے یہ بھی کہ آخر کوئی
نظر سے نظر تو ملانے لگا



حد سے بڑھنے کو ہے مجمع ترے دیوانوں کا
شہر تک سلسلہ پہنچے نہ بیابانوں کا

ایسا عالم ہے ترے چاک گریبانوں کا
نظر آتا ہے سماں شہر میں ویرانوں کا

ایک میلہ سا مرے دل میں لگا رہتا ہے
آرزوں کا تمناؤں کا ارمانوں کا

ایک بوسیدہ سی کشتی سے لڑے جاتے ہیں
واہ کیا ظرف ہے بپھرے ہوئے طوفانوں کا

کبھی پھیلاتے نہیں ہیں وہ کسی کے آگے
پاس دیوانوں کو اتنا ہے گریبانوں کا

ربط رکھیں بھی تو ہم رکھیں بھلا کس کس سے
ایک مجمع ہے درِ یار پہ دربانوں کا

دل بھی واعظ کا بہل جاتا ہے کچھ رندوں میں
وعظ ہی کے لیے دورہ نہیں میخانوں کا

پوچھنے والا بھی اُن کو نہ تھا کوئی اخگر
نام تو شمع نے روشن کیا پروانوں کا



مَیں ڈرتا ہوں اُلٹنے سے ورق اپنے فسانے کا
بدل کر رہ نہ جائے رُخ نئے سر سے زمانے کا

بہانہ ہو گیا گویا ہمارے سر جُھکانے کا
جہاں میں ہو گیا شُہرہ تمہارے آستانے کا

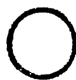
تمہیں تیر نظر پر اپنے ہے افسوس کیوں اتنا
ہے میری بد نصیبی چُوکنا اس کے نشانے کا

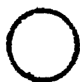
تمیز اپنے پرائے کی نہیں ہوتی ہے اب اس میں
بدل کر رہ گیا اتنا اب آئینہ زمانے کا

جسے اشک ندامت کا بس اک قطرہ سمجھا تھا
وہ نکلا اک دہانہ اس کی رحمت کے خزانے کا

معاذ اللہ ذرا سی ایک شوخی حُسن والوں کی
کہاں سے لائے گی یہ رنگ بجلی تلملانے کا

خوشی سے اور غم سے ہے عبارت آدمی اختر
خوشی تھی اس کے آنے کی تو غم ہے اسکے جانے کا





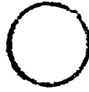
جس کسی کو بھی بہت زعم ہے دینداری کا
دوسرا نام ہے وہ اُس کی ریاکاری کا

اس توجہ سے سُنا اُس نے مرا قصۂ غم
شائبہ تک نہیں گزرا مجھے بے زاری کا

کی نہ تدبیر بچانے کی مریضِ غم کو
حال وہ پوچھتے ہی رہ گئے بیماری کا

حرم و دیر کے جھگڑوں سے نہیں ہے فرصت
بول بالا ہے زمانے میں دِل آزاری کا

رہ گئی ہو کے فنا برق بھی خود اے اخترؔ
ہے یہ انجام نشیمن پہ شرر باری کا !



رہتے رہتے ترا دیوانہ گلستاں کے قریب
بس گیا کیوں نہیں معلوم بیاباں کے قریب

دیکھنا ہے کہیں طوفاں میں ہے دم خم کتنا
بڑھے جاتے ہیں اسی واسطے طوفاں کے قریب

ان کی آواز مجھے جب بھی سنائی دی ہے
ایک شعلہ لپک اٹھا ہے دل و جاں کے قریب

بات کرتے ہیں وہ یوں دیتے ہوں پُرسہ جیسے
دوست ملنے کو اگر آتے ہیں زنداں کے قریب

مشترک ہو نہ ضرورت اگر انسانوں میں
کوئی انساں نہیں ہوگا کسی انساں کے قریب

اس لیے ہم کھڑے رہتے ہیں شب و روز وہاں
کوئی بستر نہ لگا دے درِ جاناں کے قریب

فالِ بد ہے یہ کوئی یا ہے مسرت کا سبب
کیوں قدم رُکنے لگے میرے گلستاں کے قریب

کار ساز اس کا جو ہے دُور نہیں ہے اس سے
کوئی آئے کہ نہ آئے تہی داماں کے قریب

زندگی ہی میں کسی نے نہیں پوچھا ان کو
کون پھٹکے گا بھلا گورِ غریباں کے قریب

آنے پائے نہ جنوں میں کبھی جنوں کے انداز
ہاتھ جاتا ہی نہیں جیب و گریباں کے قریب

برق کی زد میں نہ آیا ہو نشیمن اخترؔ
روشنی سی نظر آتی ہے گلستاں کے قریب



دو شعر

وہ رہ رہ کے دل کو دُکھانے لگا
شب و روز زحمت اُٹھانے لگا

ترا غم مرے دل میں بستے ہوئے
الگ اپنی بستی بسانے لگا

بخت برگشتہ کا ہے یہ انقلاب
بے حجاب اور دن میں وہ ہم سے حجاب

دیکھیے آتا ہے کیسا انقلاب
اپنے رُخ پر سے اُٹھا دیجیے نقاب

ظُلم کرنے والے اتنا سوچ لیں
حشر میں دیں گے خُدا کو کیا جواب

تھی زُلیخا کی الگ ہی بات کچھ
لوٹ کر آتا نہیں کوئی شباب

رہ گئے ہوں گے اُلٹ کر اک ورق
ورنہ رکھی تھی کھُلی پوری کتاب

صبح نکلا کس کی صورت دیکھکر
اِس قدر بشاش ہے کیوں آفتاب

دِل کی دھڑکن سے ہے قائم زندگی
زندگی میں لازمی ہے اضطراب

اس کی ہر تخلیق یوں تو خوب ہے
ہے مگر تخلیق انساں لاجواب

کہدو دشمن سے رہے اخگر سے دُور
ورنہ ہو جائے گا وہ جل کر کباب

دل کو کسی طرح سے نہیں ہے قرار آج
کیسے کٹے نہ جانے شبِ انتظار آج

ہے محوِ سیرِ باغ ہیں وہ گلعذار آج
شرمندہ ہے بساط پہ اپنی بہار آج

ان کا بھی حال ہے وہی جو میرا حال ہے
ان کو سکون ہے نہ مجھے ہے قرار آج

دھڑکن خوشی سے تیز مرے دل کی ہو گئی
وعدے کا آگیا ہے ترے اعتبار آج

کل تک شباب پر تھی مری مستیٔ حیات
محسوس ہو رہا ہے نشے کا خُمار آج

ساقی اگر رہے یہی ادبارِ میکدہ
خونِ جگر پئیں گے ترے بادہ خوار آج

وہ دیکھ چھت سے لگ گئیں آنکھیں غریب کی
مایوس ہو گیا ترا اُمیدوار آج

سُنتا ہوں وقتِ نزع دکھاتے ہیں وہ جمال
اے موت کر رہا ہوں ترا انتظار آج

اخترؔ کیا ہے بھولنے والے نے تجھ کو یاد
آتی ہیں ہچکیاں جو تجھے بار بار آج



ہم اپنے گھر کو سمجھتے ہیں رہ گزر کی طرح
یہاں ہماری سکونت بھی ہے سفر کی طرح

الٰہی ایسا محبت میں انقلاب آئے
اُدھر کا حال بھی ہو جائے کچھ اِدھر کی طرح

بدلتا رہتا ہے دِل اپنا رنگ اُلفت میں
کبھی تو شمس کی صورت کبھی قمر کی طرح

جو اہلِ زر ہیں یہاں ان کا پوچھنا کیا ہے
ہے ان کے عیب کی شہرت بھی اک ہُنر کی طرح

ٹپکتے رہتے ہیں آنسو ہماری آنکھوں سے
غمِ فراق کے احوال مختصر کی طرح

ہمارے دل کے سوا تم کہاں کہاں نہ رہے
مگر سکون کہاں پایا اپنے گھر کی طرح

غزل کو شعلہ بنانا اگر ہو اے اختر
لگاؤ آگ تم الفاظ میں شرر کی طرح



ہم مٹیں گے نہ کبھی حرفِ تمنّا کی طرح
اور اُبھریں گے ترے نقشِ کفِ پا کی طرح

حضرتِ شیخ بڑھاپے میں ہیں حوروں پہ نثار
کیا نہ کر بیٹھیں جواں ہوں جو زلیخا کی طرح

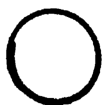
میں نہ ہوتا کبھی برباد وفورِ غم سے
میری دُنیا بھی جو ہوتی تری دُنیا کی طرح

وحشتِ دل کے تصرف کا یہ کیا کم ہے ثبوت
مجھ کو گھر بھی نظر آنے لگا صحرا کی طرح

میرے آنسو ہیں جسامت میں تو قطرے لیکن
غم میں ہے ان کی روانی کسی دریا کی طرح

دیکھنے والا نہ ہو جس کی خوشی کو کوئی
دل کھِلا بھی تو کھِلا غنچۂ صحرا کی طرح

ہوں وہ ناراض تو ہو جائیں بلا سے اخگر
ہاں میں ہاں میں نہ مِلاؤں کبھی دُنیا کی طرح



اُن کے دیوانے مر گئے شاید
عدم آباد کر گئے شاید

صبح تارے فلک سے ہیں غائب
ان پہ صدقے اُتر گئے شاید

دیکھتے ہیں کسے وہ مُڑ مُڑ کر
اپنے سائے سے ڈر گئے شاید

اور ہی رُوپ میں ہیں اب غنچے
اپنی حد سے گزر گئے شاید

مُنتظر کیوں نہیں کوئی اُن کا
کر کے وعدہ مُکر گئے شاید

اُن کے جاتے ہی بڑھ گئی اُلجھن
کوئی الزام دھر گئے شاید

اب نہیں ہے جلن وہ سانسوں میں
زخم سینے کے بھر گئے شاید

کیوں فضا ملگجی ہے اے اخگر
رُخ پہ گیسو بکھر گئے شاید



دور یاں کیوں ہیں یہ نزدیک رگِ جاں ہو کر
میں نہ اُٹھ جاؤں حجابِ رخِ جاناں ہو کر

لوحِ محفوظ میں تخلیق کا عنواں ہو کر
میں نے سجدے بھی کئے ہیں تجھے انساں ہو کر

زندگی رہ گئی حالات کا زنداں ہو کر
کتنے غم جاگ اُٹھے وقت کے طوفاں ہو کر

مرحلے وقت کی آواز ہوا کرتے ہیں
مشکلیں سامنے آتی نہیں آساں ہو کر

ناز کیوں کر نہ کروں اپنی پریشانی پر
آپ کے واسطے پھرتا ہوں پریشاں ہو کر

باغباں میں بھی ہوں واقف ترے گل بوٹوں سے
میں بھی آیا ہوں گلستاں بہ گلستاں ہو کر

زندگی کے لیے کیا کچھ نہ کیا تنہائی نے
وہ بھی اب بھاگتی ہے مجھ سے پریشاں ہو کر

لوٹ کر آئے گی پھر بن کے حیاتِ جاوید
کیا بگاڑے گی مرا عمر گریزاں ہو کر

شمعِ محفل تو بہت سے ہیں مگر اے اخگر
کون جلتا ہے چراغِ دلِ انساں ہو کر

جسم سے جاں کہیں رہتی ہے گریزاں ہو کر
مجھ سے انجان ہیں کیوں آپ مری جاں ہو کر

جاتے جاتے جو گئے سوئے گلستاں ہو کر
گل نے تنہائی کا طعنہ دیا خنداں ہو کر

کبھی بیٹھے بھی مرے پاس تو سمٹے سمٹے
وہ ملے بھی تو ملے مجھ سے گریزاں ہو کر

ہو نہ بیمار اگر اچھا تو مقدر اس کے
آپ دیکھیں تو سہی مائلِ درماں ہو کر

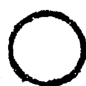
یا انھیں بھول جا، یا جاں سے گزر دیوانے
ان میں جو کام بھی تیرے لیے آساں ہو کر

جاتے جاتے وہ کہیں، آئے تھے دم بھر کیلئے
اور ہم رہ گئے شرمندۂ احساں ہو کر

زُلف بکھراؤ نہ زیبائش عارض کے لیے
دیکھنے والے نہ رہ جائیں پریشاں ہو کر

تھا سرِ حشر عجب حال بوقتِ پرسش
منہ سے اک لفظ بھی نکلا نہ پشیماں ہو کر

دُور سے شمع پہ مرتے ہیں پتنگے اخترؔ
اور دارفتہ ہے وہ شعلہ بداماں ہو کر



اگر مِل جاؤں میں دشمن سے جا کر
تو رہ جائے گا کوئی تلملا کر

کہا تو یہ کہ شاگردن جھکا کر
مجھے ایسے نہ رہ رہ کر تکا کر

تڑپ اُٹھو گے دل پر چوٹ کھا کر
کبھی دیکھو کسی سے دِل لگا کر

ہمارا شکریہ اے موت ادا کر
تجھے ظاہر کیا خود کو چھپا کر

جسے اپنا بنانا چاہتے ہیں
پہلے دیکھتے ہیں دِل دُکھا کر

پتنگوں کی عجب وارفتگی ہے
فدا ہوتے ہیں شعلوں میں نہا کر

ہمیشہ ہی جبیں پر بَل رہے ہیں
کبھی تو دیکھ لیجے مسکرا کر

گُنہ فرصت میں اکثر سوجھتے ہیں
نہ رکھ بیکار خود کو کچھ کیا کر

کوئی کیا سمجھے، ہو گر بات مُبہم
جو کہنا ہے تجھے کھُل کر کہا کر

ہمیں تو آزما کر تھک گئے ہو
کبھی دشمن کو دیکھو آزما کر

جلا کر برق کو رکھ دوں گا آخر
ذرا دیکھے نشیمن کو جلا کر



محشر میں روک ٹوک نہ ہو گر زبان پر
گھبرا نہ جائے وہ کہیں میرے بیان پر

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مرتے ہیں جان پر
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو قائم ہیں آن پر

جلتا ہو رشک کم ہے ہُما کی اُٹھان پر
پرواز ہے خلا میں نظر آسمان پر

بلوائیوں کے جاتے ہی مَیں نے مٹا دیا
وہ جو نشاں لگا کے گئے تھے مکان پر

کچھ بندے اس کے رہتے ہیں ایسے مکان میں
دیوار و در ہیں جس کے نہ چھت ہے مکان پر

ڈھاؤ گے کس پہ ظلم رہیں گے اگر نہ ہم
ڈھاؤ نہ اِتنا ظُلم کہ بن جائے جان پہ

ہے دیکھنے میں شمع کی لَو نرم جس قدر
بھاری ہے اس قدر ہی پتنگوں کی جان پر

دیکھو کہیں لڑھک کے وہ کر لے نہ خودکشی
بے چین سا جو بیٹھا ہوا ہے چٹان پر

باقی ہے آج بھی وہی صدیوں کے بعد بھی
جو کیفیت تھی رُوح کی پہلی اذان پر

وہ آستاں مِلا نہ مجھے آج تک کہیں
سر اس لیئے جُھکا نہ کسی آستان پر

انگر جو چاہے سوچے اسے اختیار ہے
جب کوئی حدِ شرع نہیں ہے گمان پر

جو مرتے ہیں حسینوں کی ادا پر
نہیں ہے کوئی حق ان کا قضا پر

سفینہ جس میں وہ دریا خدا کا
بھروسہ کیا رکھوں میں ناخدا پر

یہ کیوں ہے زحمتِ شمشیرِ قاتل
کہ ہم تو مرنے والے ہیں ادا پر

نہ دیکھو آئینہ ہر وقت دیکھو
تڑپ جاؤ گے آپ اپنی ادا پر

خوشامد کس لیے کیجے اجل کی
ہے اس میں کون سا سر خاک پا پر

نہیں ہے بے سبب خم آسماں کا
ہے اس کا سر کسی کے نقشِ پا پر

ہیں کب سے خضر خود گم کردہ منزل
ترس آتا ہے ایسے رہنما پر

تعجب ہے کہ وہ واقف نہیں ہیں
جو حق ہے آشنا کا آشنا پر

نہیں ہے حسبِ منشا کچھ بھی اخگر!
مگر راضی ہوں مالک کی رضا پر!

اس کی تلاش ہے تو برابر تلاش کر
لیکن تلاشِ عام سے ہٹ کر تلاش کر

ہو جائے منتشر نہ کہیں کارواں ہوش
اس کارواں کے واسطے رہبر تلاش کر

دُنیا اُڑا نہ دے کہیں قامت کا مضحکہ
اپنا لباس قد کے برابر تلاش کر

دُنیا کی وسعتیں کبھی کھلنے نہ پائیں گی
یوں اپنے آپ میں نہ سمٹ کر تلاش کر

رہ جائے بن کے خواب ترے دل کی ہر تڑپ
ایسا کوئی سکوں کا منظر تلاش کر

ہر مرتبہ ملیں گی نئی رفعتیں تجھے
سو مرتبہ پھر ایسے بہتر تلاش کر

آسودگیِ ذوقِ سخن کی ہے دُھن اگر
حاوی کی طرح کوئی سخن ور تلاش کر

گھر کا سکون گر تجھے گھر میں نہ مل سکے
گھر سے نکل کے شہر میں گھر گھر تلاش کر

ملتا نہیں کسی سے کبھی سوزِ دردِ انساں
خود اپنے دل کی راکھ میں اخگر تلاش کر

ایسا کوئی گناہ دلِ بے قرار کر
رکھ دے جو اور اس کے کرم کو اُبھار کر

منزل رسی کے واسطے راہ حیات میں
"سیدھا جو راستہ ہو اُسے اختیار کر"

اہلِ چمن بہار کے دھوکے میں رہ گئے
آیا چمن میں جب کوئی خود کو سنوار کر

کیا خاک ان سے درد کی تشریح کیجئے
کہتے ہیں وہ دکھایئے خاک اُتار کر

اے دوست چاہتا ہے گر آلام سے نجات
آلام کا مقابلہ مردانہ وار کر

اس درجہ یہ ہے گرمیٔ اُلفت کہ جی میں ہے
بس پھینک دیجیے جامۂ ہستی اتار کر

منظر ہے یوں ہمارے دلِ داغ دار کا
جیسے فلک سے لائے ہوں تارے اُتار کر

تجھ سے قیام گردشِ لیل و نہار ہے
اے بندۂ خدا نہ غمِ روزگار کر

اختر جو ایک بار اسے کوئی دیکھ لے
تصویر رکھ لے شیشۂ دل میں اُتار کر



آج محمود ہے نہ کوئی ایاز
بن گئے اک فسانہ ناز و نیاز

مٹ گیا فرق ہی دُرونِ نماز
کوئی بندہ نہ کوئی بندہ نواز

کیوں ہے نغمے میں اتنا سوز و گداز
کہیں اس میں نہ ہو نوائے حجاز

کوئی دے کیسے موت کو آواز
ساز سے ہے الگ نوائے ساز

اک عمارت ہے ویسے تاج محل
اس کو ممتاز کر گئی ممتاز

کوئی حق تک پہنچ سکے نہ کبھی
ہو حقیقت نہ گر شریکِ مجاز

ایک نقار خانہ ہے دُنیا
کوئی طوطی کی کیا سُنے آواز

کون سمجھے تری اداؤں کو
ہر ادا میں ہے اک نیا انداز

چھین لیتے ہیں وہ زباں اس کی
کھولتے ہیں اگر کسی پہ راز

کس طرح پھر عدم میں گزرے گی
ہو نہ جب کوئی ہمدم و دمساز

سوچتا ہوں کہ میرے بعد اختر
کون اُٹھائے گا ان کے بے جا ناز



ایک شعر

آؤ تم شیخ کی باتوں میں نہ اے بادہ کشو
یہی حضرت ہیں جو کل تک سرِ ہم جام رہے

ہماری آنکھ میں آنسو نہ آئیں گے کب تک
یہ سوزِ عشق ہے اس کو چھپائیں گے کب تک

چلے گی بات کہاں تک یہ بد مذاقی کی
مذاق غم کا رسے لوگ اڑائیں گے کب تک

ہر ایک سمت سے پتھر برس رہے ہوں جہاں
وہاں ہم آئینہ دِل بچائیں گے کب تک!

کسی زمین پہ رکھیں گے ہم بناء گھر کی
فقط یہ ریت پہ خاکے بنائیں گے ہم کب تک

اگر فلک پہ ہے باب اثر حقیقت ہیں
تو دیکھیں گے اسے نالے نہ پائیں گے کب تک

اب اس میں شک نہیں کوئی زمانہ بہرا ہے
وگرنہ حال اسے ہم سنائیں گے کب تک

ہمارے خون سے پلتے ہیں جبکہ دیدہ و دِل
ہمارا کھا کے یہ غیروں کی گائیں گے کب تک

ہر امتحاں سے گزر کر دِکھا دیا ہم نے
اب آپ اور ہمیں آزمائیں گے کب تک

جیوں گا ایں تو جیوں گا کبھی نامہ کئے اخگر
جلائیں گے تو مجھے وہ جلائیں گے کب تک

مستِ جامِ شراب ہیں ہم لوگ
ہمہ وقت آفتاب ہیں ہم لوگ

چھوڑ کر خلد کو ہیں خاک نشیں
ایسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

مر کے عریاں نہیں، کفن میں ہیں
آپ اپنا حجاب ہیں ہم لوگ

آج تک بھی ہے گریۂ آدمؑ !
ہائے کیا زیرِ آب ہیں ہم لوگ

سایہ افگن ہمیشہ رحمت ہے
بے نیازِ عذاب ہیں ہم لوگ

کتنی آباد اس کی دُنیا ہے
باعثِ انقلاب ہیں ہم لوگ

عشق ہم سے ہے درد و غم ہم سے
صاحبانِ نصاب ہیں ہم لوگ

اس زمیں نے جو خواب دیکھا تھا
اس کی تعبیرِ خواب ہیں ہم لوگ

کن فکاں اک سوال تھا اخگر
اور اس کا جواب ہیں ہم لوگ

دُخترِ رَز جو مہرباں ہے آج کل
شیخ ہم سے بدگماں ہے آج کل

دل میں اک دردِ نہاں ہے آج کل
ہر نفس پھر سوزِ جاں ہے آج کل

آ گئے حالات ایسے موڑ پر
زندگی بارِ گراں ہے آج کل

سوچ لیجے اب نہیں تو پھر سہی
چاہنے والا کہاں ہے آج کل

دیکھ کر صیّاد کا حُسنِ سُلوک
محو دل سے گُلستاں ہے آج کل

سوچتا ہوں کوئی سازش تو نہیں
مجھ پہ وہ کیوں مہرباں ہے آج کل

وقت کیا بدلا کہ ہر بد خواہ بھی
ہم کلام و ہم زباں ہے آج کل

اللہ اللہ میرے دُشمن کا عُروج
دوستوں کے درمیاں ہے آج کل

نقشِ پا کی طرح اُٹھ سکتا نہیں
اخگرؔ ایسا ناتواں ہے آج کل



رُکے ہمارے قدم کیوں یہاں نہیں معلوم
ہے کس حسین کا یہ آستاں نہیں معلوم

پھر ان کے سامنے آہ و فغاں سے کیا حاصل
جب ان کو معنیٔ آہ و فغاں نہیں معلوم

قریب ہو کے رگِ جاں سے وہ نہیں ملتے
موانعات ہیں کیا درمیاں، نہیں معلوم

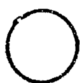
بہار آئی ہوئی ہے شباب پر لیکن
اُداس اُداس ہے کیوں گلستاں نہیں معلوم

دکھائی دیتے ہیں ہر دن نئے نئے چہرے
یہ کس نے چہروں کی کھولی دکاں نہیں معلوم

زمیں ہے خوش کہ خمیدہ ہے آسماں اس پر
مگر زمیں کو قدِ آسماں نہیں معلوم

گزر رہا ہوں منازل سے ساتھ اسکے
کہاں ہے منزلِ عمرِ رواں نہیں معلوم

ہم اپنی راہ سے منزل پہ آ گئے آخر مگر
بھٹک رہا ہے کہاں کارواں نہیں معلوم



کرنا ہے جو ہمیں وہ کیئے جا رہے ہیں ہم
اُمیدِ مغفرت پہ پیئے جا رہے ہیں ہم

پینے کی حد کو پار کیئے جا رہے ہیں ہم
دِل اس کا رکھنے اور پیئے جا رہے ہیں ہم

شاید وفا کرے کبھی ہم سے وہ بے وفا
بس اس اُمید پر ہی جیئے جا رہے ہیں ہم

دُنیا میں ہم خود آئے، بُلائے نہیں گئے
اس واسطے نباہ کیئے جا رہے ہیں ہم

دامن اگر پھٹا بھی تو اس کی یہ شان ہے
تارِ نظر سے اس کو سیئے جا رہے ہیں ہم

دُنیا نے ہم کو چھوڑ دیا ہے تو غم نہیں
دُنیا کو دِل میں ساتھ لیئے جا رہے ہیں ہم

جیسے چُکا رہے ہوں کوئی قرضِ زندگی
اخگر کچھ اس طرح سے جیئے جا رہے ہیں ہم





سوائے ان کے کوئی اور بحر و بر میں نہیں
وہ ہر جگہ ہیں نمایاں فقط نظر میں نہیں

چلے ہیں اہلِ صفا کارواں سے کترا کر
کہ سادگی و صفائی جو راہ بر میں نہیں

کسی سے میل نہیں سب سے دِل ہے صاف اپنا
ذرا بھی گردِ کدورت ہمارے گھر میں نہیں

جبیں کا داغ وہ آنسو جو آنکھ میں نہ رہے
حذف کہیں گے اسے آب جس گہر میں نہیں

یہ چل چلاؤ کی منزل ہے سب مسافر ہیں
الٰہی زادِ سفر ہی مرے سفر میں نہیں

ہر اک بشر میں ہے شر آپ سب ہیں معصوم
کہ وصف حضرت خیر البشر بشر میں نہیں

شبِ درازِ غلامی کی کٹ گئی آخر
مگر جو نورِ سحر ہے، وہی سحر میں نہیں

کس لیے اُن کا التفات نہیں
ہم میں کیا کوئی خاص بات نہیں

عیب جوئی کچھ اچھی بات نہیں
کیوں کہ بے عیب کوئی ذات نہیں

چھوڑنے والی یہ حیات نہیں
موت کے بعد بھی نجات نہیں

غم سے گھبرانے والے کیا جانیں
غم ہے اِک دین واردات نہیں

کس لئے انقلاب آتے ہیں
نامکمل تو کائنات نہیں

کونسی شئے نہیں ہے دُنیا میں
ہاں نہیں ہے تو اِک ثبات نہیں

آخری رات ہے یہ پیار والو
اس کے بعد اور کوئی رات نہیں

عبد و رب جس میں ہو گئے یک جا
کوئی اس سے حسین رات نہیں

وہ چھپاتے ہیں جس کو اے اختر
چُھپنے والی کبھی وہ بات نہیں



موج کیا جس میں پیچ و تاب نہیں
دل وہ کیا جس میں اضطراب نہیں

یوں تو دُنیا میں ہیں حسین بہت
ہاں مگر آپ کا جواب نہیں

دردمندوں کا اور غریبوں کا
دِل دُکھانا کوئی ثواب نہیں

سامنے میرے جلوۂ رُخ ہے
میری تقدیر کا جواب نہیں

تیری بخشش کے سامنے بے شک
ان گناہوں کا اِحتساب نہیں

ہوں مرکب خطا و نسیاں سے
خاک ہوں ماہ و آفتاب نہیں

شاہ بھی ہے تو کچھ نہیں اختر
جو غُلامِ ابو تُرابؑ نہیں





کون سی طرزِ جفا ہے جو تجھے یاد نہیں
اور اک مَیں ہوں کہ آمادۂ فریاد نہیں

ایک مَیں ہی نہیں دُنیا میں گرفتارِ الم
عالم آباد ہے لیکن کوئی دِل شاد نہیں

کوہساروں میں دلِ سنگ سے آتی ہے صدا
کوہ کن لاکھ سہی ایک بھی فرہاد نہیں

سُننے والوں کو نہ ہو گی کوئی عبرت حاصل
قابلِ ذکرِ خلائق مری رُوداد نہیں

کیسی دُنیائے مصائب ہے جہانِ فانی
قیدِ غم بندِ الم سے کوئی آزاد نہیں

قید ہو جانے کی حسرت تو بہت ہے دل میں
ہاں مگر گھات میں میری کوئی صیاد نہیں

بے خودی اس کی محبت میں ہے ایسی اخگر
کہ مجھے نام و نشاں اپنا بھی اب یاد نہیں



دشمنوں کا کوئی شمار نہیں
صرف دو ۔ ایک تین چار نہیں

ہر زمانے میں چار یار نہیں
اور ہوں بھی تو یارِ غار نہیں

دوزخ غم کی نار کے آگے
نارِ نمرود کوئی نار نہیں

تو نے سمجھا ہے اور کچھ اُن کو
نہیں ایسے وہ میرے یار نہیں

یہ بھی ہے اُس کی اک اداکاری
در حقیقت وہ غمگسار نہیں

اے زمیں لوٹ میرے قدموں میں
مَیں ہوں مالک کرایہ دار نہیں

مجھ کو چھیڑو نہ بادلو ورنہ
اپنی توبہ کا ذمہ دار نہیں

ہائے مَیں پردہ دار ہوں اُس کا
آپ اپنا جو پردہ دار نہیں

نہیں احباب کی کمی اخگر
ہاں مگر ان میں کوئی یار، نہیں

کسی پہلو مجھے قرار نہیں
کہیں اُن کا تو انتظار نہیں

کرم بے شمار کے آگے
میرے عصیاں کا کچھ شمار نہیں

وہ مجھے دیکھنے کو آئے ہیں
مگر آنکھوں میں انکی پیار نہیں

ذرّے ذرّے میں آشکارا ہے
پھر بھی کھل کر وہ آشکار نہیں

فوج بھی ان کے سر جھکا نہ سکی
کتنے بہتّر کوئی ہزار نہیں

زیست میری ہے میرے تن میں ہے
لیکن اُس پر کچھ اختیار نہیں ا

اُس کی بخشش کا پھر خدا حافظ
جو گنا ہوں پہ شرمسار نہیں

کیا کسی پر وہ اعتبار کرے
جس کو خود اپنا اعتبار نہیں

نام تو ہے سرِ مزار اختر
نام والا تہہِ مزار نہیں

حسین اپنے بڑھاپے میں بھی ہیں قابلِ دید
زوالِ حسن بھی ان کے لیے زوال نہیں

میں اک نیازِ مجسم تو ایک نازِ تمام
مری نظیر نہیں ہے، تری مثال نہیں

ہر اک کمال کو لازم زوال ہے اخترؔ
کمالِ عشق ہے ایسا جسے زوال نہیں



ایک ہم ہی طالبِ دنیا نہیں
اس طلب سے کوئی مستثنیٰ نہیں

اشک جاری ہیں مرے جاتے ہیں آپ
ایسی بارش میں سفر اچھا نہیں

کیا کمی کی ہے مرے احباب نے
وہ تو کہیے کچھ مرا بگڑا نہیں

میرے دامانِ دریدہ زندہ باد
تو کسی کے سامنے پھیلا نہیں

اُن کو ضد ہے ہاتھ اُٹھا کے مانگوں بھی
اور مجھ کو مانگنا آتا نہیں



جہاں کچھ آپ سے پوشیدہ میرا حال نہیں
وہاں میں عرض کروں یہ مری مجال نہیں

خدا کریم ہے دیتا ہے بے طلب سب کو
اسی لیے تو مجھے حاجتِ سوال نہیں

تجلیوں میں جو ممکن نہیں کوئی تکرار
مشاہدے کو اعادے کا احتمال نہیں

خلوصِ عشق کبھی رائیگاں نہیں جاتا
میں کیسے مان لوں ، تجھ کو مرا خیال نہیں

نہیں ہے مانعِ شانِ ظہور کوئی حجاب
نقاب میں جو چھپے وہ ترا جمال نہیں

ابد ہے سامنے میرے ازل مرے پیچھے
جہانِ عشق میں تقسیمِ ماہ و سال نہیں

رُکے جو وقت کا دھارا تو حال کہلائے
زمانِ ماضی و آئندہ حسبِ حال نہیں

کمالِ جذبِ محبت کو کہتے ہیں وہی
جو اکتساب سے حاصل ہو وہ کمال نہیں

ہے بہت اس سے بھی آگے اسکی ذات
ذہن انسانی جہاں پہنچا نہیں

آج بھی وہ جلوہ فرما ہے مگر
دیکھنے والا کوئی ہوسے نہیں

میرے آگے آگے بھی دُنیا مگر
اس کے پیچھے پیچھے میں دوڑا نہیں

چاہنے والے تمہارے لاکھ ہیں
ہاں مگر کوئی بھی اختر سا نہیں



عشق کرکے صرف میں رُسوا نہیں
آپ کا بھی کس جگہ چرچا نہیں

کون کر کے سیرِ گُلشن سے گیا
رنگ گُل کا بے سبب گہرا نہیں

ایسے اک فقرے پہ وہ ناراض ہیں
میں نے اپنے خط میں جو لکھا نہیں

دیکھتا ہوں کس پہ ہے کیسی نظر
آنکھ رکھتا ہوں میں کچھ اندھا نہیں

بخش دیجے مرنے والے کا قصور
مر گیا اور آپ سے پوچھا نہیں

آپ کیا سمجھے ہمیں فرمایئے
خیر ہم نے آپ کو سمجھا نہیں

حادثے ہوتے ہیں آخر حادثے
حادثوں سے کھیلنا اچھا نہیں

کس طرح آدم کی گزری ہے یہاں
دل ہمارا آج تک بہلا نہیں

یہ زمانہ کیا سمجھتا ہے مجھے
اس کی ذرہ بھر مجھے پروا نہیں

خیر سے اب وہ بھی عالم ہو گئے
پیٹ میں جن کے الف سیدھا نہیں

ہو تو سکتا ہوں برا ہونے کو میں
آپ جتنا سمجھے ہیں اتنا نہیں

کر سکے اخگر نہ کیوں اس کو عبور
عشق کوئی آگ کا دریا نہیں



ساتھ رہ کر بھی نظر آتا نہیں
اس کے جلوے کے لیے پردا نہیں

تیرے بھولے پن پہ رحم آتا ہے دل
عشق تجھ کو راس آنے کا نہیں

سامنے ہے اک پتنگے کی مثال
لو بڑھے تو جان کی پروا نہیں

آپ کا دل مجھ سے میلا ہو تو ہو
میرا دل تو آپ سے میلا نہیں

خونِ دل بہتا ہے رِس کر آنکھ سے
آخر آنسو ہے کوئی دریا نہیں

اب یہ کس کو پوچھنے نکلے ہیں آپ
خود مزاجِ دُشمناں اچھا نہیں

آپ کا جلوہ ہی خود محجوب ہے
میری آنکھوں پر کوئی پردا نہیں

وضع کے پابند لوگوں کو نہ چھیڑ
بان جل کر بھی بَل جاتا نہیں

آیئے نا، اک زمانہ ہو گیا
خواب میں بھی آپ کو دیکھا نہیں

دیکھ لی اے دل تری دریا دلی
آنسوؤں کا سلسلہ ٹوٹا نہیں

آپ کو معلوم ہے اخگر ہوں میں
دوسروں کی آگ میں جلتا نہیں



جب سے اک غم کا آسرا بھی نہیں
زندگی میں کوئی مزا بھی نہیں

کبھی ملتا بھی ہے تو یوں ہم سے
جیسے ہم کو وہ جانتا بھی نہیں

ہو گئے خاک جس کی خاطر ہم
اس کا احساس اسے ذرا بھی نہیں

دل جگر جل رہے ہیں فرقت میں
اور اس کا کہیں پتا بھی نہیں

یہ عجب بات ہے کہ دل میرا
رہ نما بھی ہے رہنما بھی نہیں

دل میں رہ کر بھی وہ نہیں ملتے
جب کہ کچھ ایسا فاصلہ بھی نہیں

دل بجھا تو حیات ہیں اخگر
روشنی تو کُجا ضیا بھی نہیں

○

عجیب رنگ سے گزری مری زمانے میں
ملا نہ چین قفس میں نہ آشیانے میں

ملے گا لُطف انھیں گریہ و تبسّم کا
نہاں ہیں دونوں بھی پہلو مرے فسانے میں

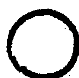
کسی سے ہو نہ سکا میری بے کسی کا علاج
ملا نہ چارہ گر ایسا کوئی زمانے میں

کوئی نہ دیکھے حقارت سے چار تنکوں کو
ہے برق کی بھی جگہ میرے آشیانے میں

اجل ذرا مری دریا دلی کی داد تو دے
اُجڑ کے رہ گیا میں خود تجھے بسانے میں

یہ جانتا ہوں کہ دیتے ہیں وہ فریب مگر
مَیں کیا کروں کہ مزہ ہے فریب کھانے میں

بیان درد کی لذّت نہ ہو سکی اخگر
جو لُطف مجھ کو ملا ہے اسے چھپانے میں



عجب کرشمہ وہ تیر نظر دکھاتے ہیں
عدو ہیں زد میں مگر دوست تلملاتے ہیں

بہار آئے تو احساس گردو پیش کہاں
اسیر دامِ قفس میں بھی گنگناتے ہیں

ضمیر پاک ہے گر واقعی حسینوں کا
جھجک جھجک کے نظر ہم سے کیوں ملاتے ہیں

ہے اک زمانہ جو رہتا ہے ہم سے بیگانہ
ہیں ایک ہم کہ زمانے کے غم اٹھاتے ہیں

قضا سے پہلے نہ پوچھا ہمیں کسی نے بھی
قضا کے بعد زمانے کو یاد آتے ہیں

قیام حشر الٰہی اب اور کب ہوگا
جو دشمنوں سے نہ ہو دوست کر دکھاتے ہیں

نہ رُک گئی ہوں کہیں دل کی دھڑکنیں اخگر
وہ میرے سینے سے گھبرا کے ہاتھ اٹھاتے ہیں





ہم ان کے سامنے جب پیار کا اظہار کرتے ہیں
نظر جھکتی ہے ایسی جیسے وہ بھی پیار کرتے ہیں

محبّت کی نظر پہچاننا بھی ہم کو آتا ہے
نہ جانے آپ کیوں انکار پر انکار کرتے ہیں

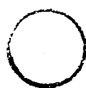
جنوں کا تو تقاضا ہے گریباں چاک کر دیجے
مگر ہم ضبط کرتے ہیں لحاظِ یار کرتے ہیں

نگاہِ خاص کی اک آزمائش کے لیے شاید
مری سوئی ہوئی قسمت کو وہ بیدار کرتے ہیں

بناتے ہیں ہمیشہ آشیاں ہم برق کی زد میں
بقائے گلستاں کے واسطے ایثار کرتے ہیں

سرِ میخانہ بن جاتا ہے وہ مرکز نگاہوں کا
وہ اپنی مست نظروں سے جسے سرشار کرتے ہیں

حرم والوں کو اختر پوچھتے ہیں کب حرم والے
جنابِ شیخ کی عزّت تو کچھ میخوار کرتے ہیں



اثرات اس میں کیمیا کے ہیں
کیا مقدر مری دعا کے ہیں

کہہ چکے تھے بلیٰ جو روزِ الست
ہم گرفتار اسی بلا کے ہیں

چیخ اٹھا دیکھ کر میں ہشت بہشت
ان کے کوچے کے دھندلے خاکے ہیں

بے رخی ہو کہ التفات ان کا
ہم تو قربان ہر ادا کے ہیں

جس خدا پر ہے شیخ کا ایمان
ہم بھی بندے اسی خدا کے ہیں

جا بجا منتشر ہوا ابلیس
جسم اس کی غلط انا کے ہیں

قبر پر بھی نہ آئے وہ اخگر
خوب بدلے مری وفا کے ہیں

غم زدہ جتنے بھی ہیں غم کو بُرا کہتے ہیں
اہلِ دِل اپنی زباں میں اِسے کیا کہتے ہیں

جو بُرے ہیں وہ بھلوں کو بھی بُرا کہتے ہیں
جو بھلے ہیں وہ بُروں کو بھی بھلا کہتے ہیں

زیست کو زیست سمجھتے ہیں سمجھنے والے
ہم تو ناکردہ گناہوں کی سزا کہتے ہیں

کوئی مائل بہ جفا اور ہی جذبے سے سہی
ہم مگر اس کو محبت کی ادا کہتے ہیں

اہلِ دُنیا جسے کہتے ہیں خطائے منصور
اس کو سلجھے ہوئے لفظوں میں انا کہتے ہیں

وہ ملے کیسے جو پہلے سے مقدر میں نہیں
خود فریبی ہے جسے لوگ دُعا کہتے ہیں

ہجر کے جادۂ دشوار کا ہے نام حیات
وصل کی منزلِ آساں کو قضا کہتے ہیں

زُلف بکھرا کے نہ نکلو کہ بدل جائے گی رُت
کیوں کہ بکھری ہوئی زلفوں کو گھٹا کہتے ہیں

آپ تو خیر قدآور ہیں مگر اے اخترؔ
آج کے دور میں بونوں کو بڑا کہتے ہیں



جب وفورِ شوق میں خود سے گزر جاتا ہوں مَیں
آپ کو نزدیک سے نزدیک تر پاتا ہوں مَیں

جانتا ہوں ایک دھوکا ہے سراسر زندگی
ہے فریبِ آرزو جو دل کو بہلاتا ہوں مَیں

جام و مینا کی کوئی حاجت نہیں ساقی مجھے
دیکھ کر مخمور آنکھیں مست ہو جاتا ہوں مَیں

زندگی کے واسطے میری ہے یہ زندہ مثال
کس طرح ہر آن ہٹ کر زندگی پاتا ہوں مَیں

کاٹتا ہوں زندگی کے دن کچھ اس انداز سے
اشکِ غم پیتا ہوں اور زخمِ جگر کھاتا ہوں مَیں

چاہتا ہوں آپ سے بچ کر نکل جاؤں مگر
جس طرف بھی دیکھتا ہوں آپ کو پاتا ہوں مَیں

جستجو میں رات دن اخگرؔ کسی کی کیا کہوں
دَر بدَر کی کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتا ہوں مَیں



کیا لطف مل رہا ہے ترے انتظار میں
ہنگامہ اک بپا ہے تڑپ میں قرار میں

سینے میں تھے جو زخم نہاں وہ اُبھر گئے
منظر بہار کا ہے دلِ داغ دار میں

دُنیا میں رہنے کی یہ سزا بھی عجیب ہے
تا حشر بند رہنا ہے کنجِ مزار میں

اشکوں کی طرح نرم روی جانتا نہیں
بس اک یہی ہے عیب بڑا آبشار میں

وہ حشر کا مذاق اُڑا کر گزر گیا
گزرا جو دن اُمید میں یا انتظار میں

وعدے کے ساتھ کیوں یہ تبسم ہے زیرِ لب
پڑتا ہے اس سے فرق بہت اعتبار میں

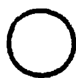
موت و حیات یوں تو ہے سب کے لیے مگر
یہ اختیار میں ہے نہ وہ اختیار میں

منکر نکیر آ گئے کیسے ؟ کمال ہے
داخل ہوا بھی ہو نہ سکے جب مزار میں

دامن تو تھام لیتا ہے ہر اہلِ حسن کا
گل میں نہیں وہ بات جو ہے ایک خار میں

دامن کی دھجیوں سے فلک ڈھک کے رہ گیا
میں چھا گیا بہار پہ فصلِ بہار میں

اختر کا سر ہے گا ترے نقشِ پا سے کیوں
مرکز گریز خو نہیں اِس خاکسار میں



کون ہے ایسا جلوہ افگن
اک عالم ہے روشن روشن

بڑھنے کو ہے دیوانہ پن
خیر منائے اپنی دامن

کرنے والے سیرِ گلشن
کاش بچا کر لائیں دامن

رسوا کرنے والے دشمن
آپ ہیں ہم سے ناحق بدظن

بھول لیے کیا ڈھونڈ رہے ہو
بھول گئے کیا میرا مدفن

غیر سے ہیں وہ اُلجھے اُلجھے
ہونے لگی ہے ہم کو اُلجھن

ایسا ہے کچھ فرقِ تنائل
ایک نہ ہوں گے شیخ و برہمن

عشق میں ایسے عقل و جنوں ہیں
یہ ہے مدّھم وہ ہے روشن

اس نے یقیناً یاد کیا ہے
تیز ہوئی کیوں دل کی دھڑکن

شرحِ دماغ و دل کیا کیجے
ایک ہے رہبر ایک ہے رہزن

برق بھی ہٹ جائے گی اخگر
پھونکے گی گر میرا نشیمن

تیرے کوچے سے جب گزرتا ہوں
تھام کو دل کو آہ بھرتا ہوں

ہے اُمید اور بیم کا عالم
روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں

نامکمل ہے زیست کی تصویر
خونِ دل سے میں رنگ بھرتا ہوں

کیسی آب و ہوا میسّر ہے
خون روتا ہوں آہ بھرتا ہوں

آپ کا وعدہ اور پورا ہو
پھر بھی مَیں اعتبار کرتا ہوں

خواہ مہر و کرم ہو قہر و غضب
مَیں تری ہر ادا پہ مرتا ہوں

راہ زن، راہ بر کے بھیس میں ہے
کس کٹھن راہ سے گزرتا ہوں

کیا کہوں دل پہ کیا گزرتی ہے
ان کے کوچے سے جب گزرتا ہوں

وقت نازک ہے آج کل اختر
اپنے سائے سے آپ ڈرتا ہوں



جس سمت بھی مَیں ان کی نظر دیکھ رہا ہوں
دُنیا کی نِگاہوں کو اُدھر دیکھ رہا ہوں

منہ پھیر کے وہ ضبط کیے جاتے ہیں آنسو
اِتنا تو اب آہوں میں اثر دیکھ رہا ہوں

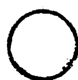
یا ہے رُخِ روشن پسِ گیسوئے پریشاں
یا شام کے پردے میں سحر دیکھ رہا ہوں

اے دوست عطا ہو کبھی عرفانِ نظر بھی
جلوے تو ترے شام و سحر دیکھ رہا ہوں

غمخوارئ حالات کی اُمید تھی جن سے
ان کو بھی ترے زیرِ اثر دیکھ رہا ہوں

دیکھیں گے اگر وہ بھی تو ٹکرائیں گی نظریں
اس واسطے میں سوئے قمر دیکھ رہا ہوں

آئے بھی کبھی کے وہ چلے بھی گئے اخگرؔ
لیکن مَیں خُدا جانے کدھر دیکھ رہا ہوں



جس طرح بھی بن پڑے نبا ہوں
کیا چاہیئے پھر جو تجھ کو چاہوں

اپنے زخمِ جگر کے ٹانکے
ہر تارِ نفس سے سی رہا ہوں

دل کاشفِ سرِّ مَنْ عَرَفْ ہے
مَیں ماحِیِ نقشِ مَاسِوا ہوں

بادل سی برس رہی ہیں آنکھیں
دیدار کو مَیں ترس رہا ہوں

دیکھو تو کرشمۂ محبّت
مر کر بھی کسی پہ جی رہا ہوں

ذرّہ ہوں مگر ہوں مہر پیوند
قطرہ ہوں محیط آشنا ہوں

اب سوزِ جگر نہ پوچھ اخگر
مَیں اپنی ہی آگ میں جلا ہوں

نہیں سوچا کبھی اچھی بُری کو
بھلا اتنا بھی غصہ آدمی کو

سُناؤں حال کیا اپنا کسی کو
نہیں لگتی ہے کوئی بات جی کو

کنارے چھوڑ کر اہلِ خودی کو
پھلانگا ایک بے خود نے ندی کو

ارے توبہ یہ آنکھیں اور آنسو
خُدا کے واسطے روکو ہنسی کو

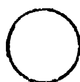
حیاتِ خضر میں ہے راز پنہاں
نہیں ہے راس دُنیا ہر کسی کو

نہ ہو کیوں پھول بننے چاک دامن
کلی کب تک چھُپائے بے کلی کو

پتنگے شمع کے ہوتے ہی روشن
سلامی دینے آئے روشنی کو

بھرم رکھا ہے غم کا مُسکرا کر
دُعائیں دو مری زندہ دلی کو

سہارا دیتے ہیں وہ خود ہی اختر
پریشاں سے پریشاں آدمی کو



تکلف اس کا اُٹھ جائے تو کیا ہو
بلاتے ہی قضا آئے تو کیا ہو

دلوں سے کھیلنا اچھا نہیں ہے
کسی کی جان پہ بن جائے تو کیا ہو

ہر اک خود کو خُدا سمجھا ہوا ہے
اگر منصور پھر آئے تو کیا ہو

تلاطم خود "تلاطم سے بچا کر
مجھے اس پار لے جائے تو کیا ہو

محیطِ کُل مرے چھوٹے سے دل میں
اگر آ کر سما جائے تو کیا ہو

مَن و تُو کا جو پردہ درمیاں ہے
کبھی یوں ہی سرک جائے تو کیا ہو

تلاشِ یار میں، میں گھر سے نکلوں
ادھر وہ میرے گھر آئے تو کیا ہو

جو ہاں کہہ کر ہمیشہ ٹالتا ہے
کبھی ہاں کہہ کے شرمائے تو کیا ہو

مری آوارہ گردی ہی کسی دن
مجھے منزل پہ پہنچائے تو کیا ہو

مری جاں کے نکلتے وقت کوئی
اچانک ہی چلا آئے تو کیا ہو

مجھے تڑپانے والے کو بھی اخترؔ
کسی سے پیار ہو جائے تو کیا ہو



جتنے بھی غم ہیں، مرے دل کے حوالے کر دو
ہیں یہ رہرو، انھیں منزل کے حوالے کر دو

باز آئے نہ تڑپنے سے جو بسمل کوئی
ڈھونڈ کر تم کسی قاتل کے حوالے کر دو

پھینک دو گے تو نہ بن جائے وہ رائی کا پہاڑ
پڑھ کے مکتوب کو حامل کے حوالے کر دو

وہ جنوں پیشہ جو بھاری ہو خرد مندوں پر
اس کو لے جا کے سلاسل کے حوالے کر دو

کون ہوں کیا ہوں مَیں کیا اس سے غرض دربانو
تم مجھے صاحبِ محفل کے حوالے کر دو

کہہ گئے دیکھ کے وہ اپنے مریضِ غم کو
رُوح بیمار ہے عامل کے حوالے کر دو

نہ چلا زور مری ناؤ پہ جب طوفاں کا
چیخ اُٹھا اسے ساحل کے حوالے کر دو

ہاتھ دُنیا کا طلب گار نہ کھینچے گا کبھی
ساری دُنیا بھی جو سائل کے حوالے کر دو

یا گلستاں کی نئے سر سے کرو آرائش
یا گلستاں کو عنادل کے حوالے کر دو

مرنے والے کے قدم اُٹھ نہیں سکتے خود سے
لاد کر دوش پہ منزل کے حوالے کر دو

رکھ دو اک آئینہ تم ان کے مقابل اخگر
آج قاتل ہی کو قاتل کے حوالے کر دو



وہ جب پیش آئے مروت کے ساتھ
انھیں میں نے دیکھا ہے حیرت کے ساتھ

اذیت بھی دیتے ہیں راحت کے ساتھ
وہ ہر کام کرتے ہیں جدّت کے ساتھ

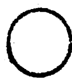
نکلتے ہیں آنسو انھیں دیکھ کر
ہے وابستہ غم بھی مسرت کے ساتھ

کھلا پھول گلشن میں ہنستے ہوئے
مگر ہو گیا ختم عبرت کے ساتھ

یہ مانا کہ ہو جاؤ گے نامور
ہیں جھگڑے بھی اُتنے ہی شہرت کے ساتھ

سمجھتے ہیں خود دارِ نعمت اسے
ملے پاؤ ٹکڑا جو عزت کے ساتھ

گنہ بخشے جائیں گے اخگر ضرور
ہے بس شرط توبہ ندامت کے ساتھ





ہے دشمنی اجل کو بھی کس دوستی کے ساتھ
ہر دم لگی ہوئی ہے مری زندگی کے ساتھ

جاتی نہیں ہے قبر میں دولت کسی کے ساتھ
رہتے ہیں آدمی کے عمل آدمی کے ساتھ

تیری خوشی ہے اس میں تو اچھا یہی سہی
ہم کو ہر ایک غم ہے گوارا خوشی کے ساتھ

کس طرح خیر و شر میں بھلا امتیاز ہو
دُنیا میں تیرگی جو نہ ہو روشنی کے ساتھ

جینے کو تیرے غم کا سہارا اگر نہ ہو
دُنیا جہاں میں کون جیئے گا خوشی کے ساتھ

قصدِ حرم تھا دیر کی جانب اُٹھے قدم
کعبے کو ہم پہنچ چکے اس کج روی کے ساتھ

دِل ہے کہیں، نگاہ کہیں ہے قدم کہیں
تیری گلی سے نِکلے ہیں اس بے خودی کے ساتھ

چشمک ضرور چاہیئے باراں و برق میں
آنسو مرے سموئیے اپنی ہنسی کے ساتھ

وہ تو کہو کہ موت بڑے کام آ گئی!!
ممکن نہ تھا نباہ مرا زندگی کے ساتھ

پھر جاتی ہے نگاہ میں جب ان کی بے رخی
ملتے نہیں عدو سے بھی ہم بے رخی کے ساتھ

وہ دوست ایک دوست فراموش ہی سہی
لیکن ہے اس کی یاد مری زندگی کے ساتھ

وہ سادگی، وہ طرز بیاں، وہ اثر کہاں
اٹھ کر گیا صفیؔ کا تغزل صفیؔ کے ساتھ



ایک شعر

فلک پہ برق چمکنے لگی پئے تخریب
کچھ اس طرح سے کی تعمیر آشیاں میں نے



اُنھیں معلوم کیا حالت کسی کی
کٹی کیسے شبِ فرقت کسی کی

میں ان کے پاس ہو کر بھی جُدا ہوں
نہ پھوٹے اس طرح قسمت کسی کی

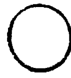
نہ اِترا دولتِ دُنیا پہ ناداں
رہی باقی کہاں دولت کسی کی

وہ دِل لے کر مُکر جاتے ہیں میرا
بدل جاتی ہے یوں نیت کسی کی

پلٹ کر بھی نہ دیکھیں گے ہم اس کو
نہ ہو جس بزم میں عزت کسی کی

ہے کلمے میں خدا کے نام اُن کا
نہیں ہے ایسی تو عظمت کسی کی

ترے اعمال کام آئیں گے اختر
نہیں کام آئے گی اُلفت کسی کی



سمجھ میں آئیں نہ اپنی سمجھ میں آنے کی
ہیں کچھ عجیب یہ نیرنگیاں زمانے کی

اگر ہے فکر یہاں سے مجھے اُٹھانے کی
مٹا دے ماتھے سے تصویر آستانے کی

بھری ہوئی ہیں ان آنکھوں میں بجلیاں ایسی
کسی میں تاب نہیں ہے نظر ملانے کی

سُنائے جاتے ہیں جو کچھ بھی جی میں آتا ہے
کبھی تو بات کریں کچھ سمجھ میں آنے کی

یہ انقلاب عجب انقلاب ہے کہ یہاں
ہر اک کو فکر ہے بس آبرو بچانے کی

کریں یہ وعدہ کہ وعدہ نہیں بھلائیں گے
وگرنہ آپ کو عادت ہے بھول جانے کی

ہزار بار ہمیں آزمائے دیکھ لیا
مگر ہے پھر انھیں دھن ہم کو آزمانے کی

جب اک جھلک ہی پہ بے ہوش ہو گئے موسیٰ
پڑی تھی پھر انھیں کیا اپنا منہ دکھانے کی

گُناہ گاروں کو نسبت ہے ان سے کیا کم ہے
تلاش کرتی ہے رحمت تو بس بہانے کی

جنابِ شیخ بھی آئے ہیں شوق فرمانے
بڑی ہے خطرے میں عزت شراب خانے کی

تمہارے نقشِ قدم پر نظر جو رکھتے تھے
اُنھیں مٹا نہ سکیں گردشیں زمانے کی

جلا کے رکھ دیا اخگر کو سوزِ فُرقت نے
اُمید ہی نہ رہی اب نمُود پانے کی



کس کو پینے سے عار ہے ساقی
اک جہاں بادہ خوار ہے ساقی

گُلستاں ہے، بہار ہے ساقی
اب تجھے اختیار ہے ساقی

اپنے ہاتھوں سے جام دے ورنہ
قطرۂ مے بھی بار ہے ساقی

کیا ہیں خم وہ شیخ بیٹھے ہیں
اور تو پردہ دار ہے ساقی

جام دے گر لگا کے ہونٹوں سے
باعثِ افتخار ہے ساقی

ساری دُنیا اگر ملے مجھکو
وہ بھی تجھ پر نثار ہے ساقی

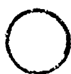
یہ نہیں کوئی قلقلِ مینا!
تشنہ لب کی پُکار ہے ساقی

ڈھل گیا دن بھی آ گئے ہم بھی
کس کا اب انتظار ہے ساقی

سال بھر تیرے جلوۂ رُخ سے
میکدے میں بہار ہے ساقی

چل بسا تو نہیں ہے رند کوئی
کیوں فضا سوگوار ہے ساقی

کر نہ اختر سے کوئی غیبت
وہ بھی اک بادہ خوار ہے ساقی



جب سے تو بدگماں ہے ساقی
ایک آفت میں جان ہے ساقی

اشک خونیں کا راز کیا کہیے
یہ بڑی داستان ہے ساقی

لے رہی ہے بلائیں خاموشی
کیسا تو بے زبان ہے ساقی

کیوں نہ ہوں ساری مشکلیں آساں
جب خدا مہرباں ہے ساقی

تجھ کو دیکھے بغیر لوں ساغر
یہ تو اک امتحان ہے ساقی

جس جگہ پانو رند کا بہکے
وہ زمین آسمان ہے ساقی

دلِ اخگر میں روشنی سی ہے
کون یہ میہمان ہے ساقی

عشق نے بدل ڈالی کائنات ہی اپنی
زندگی ہے غم اپنا غم ہے زندگی اپنی

آپ کی محبت پر کس طرح یقین آئے
جو شنیدنی اپنی ہے نہ دیدنی اپنی

ہم نے روح خوشیوں کی اپنے واسطے رکھ لی
ان کے واسطے کر دے وقف ہر خوشی اپنی

اتنی روشنی کب تھی ان کے آنے سے پہلے
تیز کی چراغوں نے ان سے روشنی اپنی

عاشقی کے افسانے خواب بھی تو ہوتے ہیں
اس نے پھیر لیں نظریں آنکھ کھل گئی اپنی

غیر مطمئن ہیں وہ غیر کی صفائی سے
بات کٹ گئی اس کی لاج رہ گئی اپنی

تھام ہی لیا بڑھ کر ہم نے یار کا دامن
کام آ گئی آخر آج بے خودی اپنی

کیوں ملال ہو ہم کو اپنی جان جانے کا
جس نے جان بخشی تھی اس نے جان لی اپنی

جھوٹ ہی سہی لیکن کہیے گا کیا آخر
چھوٹ ہی نہیں سکتی اب تو شاعری اپنی

میری حالت غیر اگر ہو جائے گی
خود بخود ان کو خبر ہو جائے گی

ان سے راہ و رسم اگر ہو جائے گی
زندگی اچھی بسر ہو جائے گی

بنتے بنتے ہر خلش درمان دل
بے نیاز چارہ گر ہو جائے گی

پہلے تاثیر بیاں پیدا تو کر
بات پھر کچھ کارگر ہو جائے گی

کیوں شب فرقت نہیں اب ناگوار
یہ بلا کیا میرے سر ہو جائے گی

دیکھتا ہے آئینہ کیوں بار بار
تجھ کو خود تیری نظر ہو جائے گی

وصل کی شب اس کا اندازہ نہ تھا
باتوں باتوں میں سحر ہو جائے گی

نرگس اس اُمید پر بے خواب ہے
اک نہ اک دن دیدہ ور ہو جائے گی

ساتھ کیا اخگر سکا دے عمرِ رواں
بڑھتے بڑھتے مختصر ہو جائے گی



اگر شعور میں انساں کے پختگی ہو گی
کبھی جنوں سے پسپا نہ آگہی ہو گی

انانیت سے نہ جب تک انا بری ہو گی
خودی کے واسطے لازم نہ بے خودی ہو گی

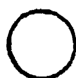
یہ بات نامہ بر اس نے نہیں کہی ہو گی
جو بات اس نے کہی ہے وہ دوسری ہو گی

چلے گا کام نہ محفل میں ان چراغوں سے
جلاؤ دل تو ذرا تیز روشنی ہو گی

ملے تھے مجھ سے جہاں پھر وہاں وہ مل نہ سکے
وہاں سے راہ کہیں اور مڑ گئی ہو گی

سب ایک جیسے نظر آئیں گے قیامت میں
وہاں کسی کو کسی پر نہ برتری ہو گی

تڑپ کے قبر میں پھر آ گئی حیات اختر
ذرا سی دور مجھے چھوڑ کر گئی ہو گی



کام دنیا تو کم ہی آئے گی
اس پہ احسان الگ جتائے گی

روٹھ کر کتنی دور جائے گی
زندگی قبر میں خود آئے گی

ہے مرے ساتھ میری ماں کی دعا
آڑے وقتوں میں کام آئے گی

چاہو مرنا تو مر نہ پاؤ گے
چاہو جینا تو موت آئے گی

تھک گئی ہم سے بھڑ کے خود دنیا
اور ابھی کب تک آزمائے گی

ہم سے منہ پھیر لے حیات اگر
شکل تک بھی نظر نہ آئے گی

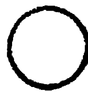
موت کب ہے درست ٹک ٹک سے
ہم کو کس منہ سے منہ دکھائے گی

شیخ اس ہیئت کذائی میں
حور کیوں تجھ کو منہ لگائے گی

وہ بھی حورانِ خلد میں ہوں اگر
کیا طبیعت کسی پہ آئے گی

ناخدا بھی صدا خدا کو دے
ناؤ ہرگز نہ ڈگمگائے گی

برق ہو جائے گی بھسم اخترؔ
آشیانہ اگر جلائے گی



مختصر سے مختصر ہے جو یہاں ہے زندگی
جان دیتے ہی عدم میں جاوداں ہے زندگی

دائرے میں سال و سنہ کے کہاں ہے زندگی
لے احاطہ کرنے والو بیکراں ہے زندگی

تم ہلو تو اک بہارِ گلستاں ہے زندگی !!
ورنہ میرے حق میں پت جھڑ ہے خزاں ہے زندگی

ہر کسی پر مثلِ سورج کے عیاں ہے زندگی
اور پھر ناقابلِ شرح و بیاں ہے زندگی

دُور رہتے کیوں کبھی کے اُن سے ہو جاتے قریب
ہے تو مجبوری یہی ہے۔ درمیاں ہے زندگی

حیرت اس پہ ہے کہ فرق آیا نہیں رفتار میں
ابتدائے آفرینش سے رواں ہے زندگی

حل نہ لقمان و ارسطو جیسے دانا کر سکے
چیستانوں میں اک ایسی چیستاں ہے زندگی

زندگی کی ہمنوائی سے کسے کیا مِل گیا
ہمنوا تو ہو گئے بوڑھے جواں ہے زندگی

اک نئی منزل کی ہر منزل پہ ہے اس کو تلاش
جس کی منزل ہی نہیں وہ کارواں ہے زندگی

زندگی تو ایک ہے لیکن جگہ کے فرق سے
کچھ یہاں ہے زندگی تو کچھ وہاں ہے زندگی

حق میں اک بُلبل کے اخگر روح پرور ہی سہی !
حق میں اک پروانے کے آتش فشاں ہے زندگی



فرازِ طور سے جس کو پیامِ حُسنِ یار آئے
نہیں ممکن اسے بے ہوش ہونے تک قرار آئے

نہیں مانگا تھا دِل مَیں نے، مگر جب دیدیا تُو نے
خوشی اب دل کی جس پہ چاہے وہ بے اختیار آئے

وہ منظر دیکھتے ہیں میرے اشکوں کی روانی کا
اب اس کے بعد کیا ان کی نظر میں آبشار آئے

بہت اچھی سہی جنّت مگر یہ غور کرنا ہے
ضروری تو نہیں آب و ہوا بھی سازگار آئے

جفا کا شوق ہے اُن کو وفا کا خبط ہے ہم کو
نہ اُن کو ہی قرار آئے نہ ہم کو ہی قرار آئے

نہیں ہے کچھ مری دیوانگی پابندِ گُلشن کی
رہوں گا مَیں قفس میں تو قفس ہی میں بہار آئے

تمہارے حُسن کی شُہرت دو عالم میں سہی لیکن
کبھی جلوہ دِکھاؤ تو نظر کو اعتبار آئے

مسلسل چھیڑ ہو گی جب تلک اے اخگرِ رگِ جاں سے
بہت مشکل ہے دل کی بیقراری کو قرار آئے

کرم کی آس کیا دُنیا جہاں سے
نگاہیں لگ گئیں جب آسماں سے

ہٹا صیاد نظریں آشیاں سے
نکل جائے نہ کچھ تیری زباں سے

نہیں ہے ہاتھ اگر پتھر کے نیچے
اُٹھاؤ تو ذرا سر آستاں سے

کوئی منزل یقیناً اس کی ہوگی
جو ہٹ کر چل رہا ہے کارواں سے

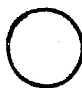
ہماری ہی روش پر چل پڑا ہے
عجب لغزش ہوئی ہے رازداں سے

بدلتا جا رہا ہے رنگ ہر دم
ہٹا لے اب نگاہیں آسماں سے

تمہارے نقشِ پا پہ چلنے والے
گزر جاتے ہیں ساتوں آسماں سے

خطا کو درگزر فرمانے والے
ادا ہو شکر تیرا کس زباں سے

مقامِ دل بھی کیا مرکز ہے اختر
کئی رستے نکلتے ہیں یہاں سے



ربط ساقی سے ہے، مانوس ہیں میخانوں سے
ہم نے پیمانِ عمل باندھا ہے پیمانوں سے

یہ توقع نہیں کم حوصلہ انسانوں سے
حوصلہ مند ہی ٹکرائیں گے طوفانوں سے

لے سبق، دیدۂ عبرت ہو تو ویرانوں سے
بستیاں یہ کبھی آباد تھیں انسانوں سے

کہیں ایسا نہ ہو ٹھن جائے کسی دن بے ڈھب
چھیڑ ناصح کی یہ اچھی نہیں دیوانوں سے

شرم سے ثروتِ دنیا نے جھکا لیں آنکھیں
جب نظر اس کی ملی ہے تہی دامانوں سے

ناخدا تُو ہمیں طوفاں سے ڈراتا کیا ہے
ہم کو جرأت کے سبق ملتے ہیں طوفانوں سے

یہ بھی اک دَور ہے بے واسطۂ جام و سبو
نظریں ساقی کی جو مل جاتی ہیں مستانوں سے

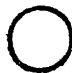
کوئی مہکا ہوا، اٹھلاتا ہوا آتا ہے
یا صبا جھومتی آتی ہے گلستانوں سے

آنکھوں آنکھوں میں پیا کرتا ہوں میں بادۂ شوق
ساغروں سے مجھے اب کام نہ پیمانوں سے

مجھ پہ احسان یہ کیجیے کہ نہ کیجیے احسان
سخت شرمندہ ہوں میں آپ کے احسانوں سے

وسعتِ دل کہوں یا عرصۂ محشر سمجھوں
یہ جو برپا ہے قیامت مرے ارمانوں سے

سیکھ جینے کا زمانے سے سلیقہ اخگر
شکوہ اپنوں ہی سے جائز ہے نہ بیگانوں سے



ایک شعر

شیخی نہ بھول جائیں تو میں ذمہ دار ہوں
ساقی جناب شیخ کو تھوڑی پلا تو دے

یہ پوچھو پوچھنے والو ہماری چشم حیراں سے
نظر آئے عدوِ اسلام کے کیا کیا مسلماں سے

ہماری ناؤ کو کیا خوف ہو سکتا ہے طوفاں سے
اب اس کا واسطہ ہے اصل میں اصلی نگہباں سے

بنام ارتقائے زیست کیسا وقت آیا ہے
کہ دوری چاہتا ہے آج خود شیطان انساں سے

یہ عالم ہے کہ اب ہر گام پر آنکھیں دکھاتی ہے
کبھی نظریں ملا سکتی نہ تھی دنیا مسلماں سے

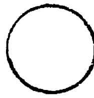
وہ نزدیک رگِ جاں ہیں تو خود اندازہ کر لیجے
ہمارے ہاتھ کو قربت ہے کتنی اسکے داماں سے

نہیں ہے موت پر غم کا محل، موقع خوشی کا ہے
ہوئے میعاد پوری کر کے ہم آزاد زنداں سے

الگ پھولوں کی خوشبو سے یہ کیسی ہے مہک آخر
گیا ہے سیر کر کے کیا کوئی گل رو گلستاں سے

فلک کے ماہ سے ممکن نہیں تھا جو قیامت تک
اُجالا مصر میں ایسا ہوا تھا ماہ کنعاں سے

تماشا دیکھتی رہتی ہے قدرت رات دن اخترؔ
زمانہ کھیلتا رہتا ہے ہر مجبور انساں سے



گئے ہیں وہ خفا ہو کر یہاں سے
کہیں ہم بھی گزر جائیں نہ جاں سے

خلش پوچھے کوئی تیرِ نظر کی
جگر سے، دل سے، جانِ ناتواں سے

قفس سے ہو گئی ہے جب سے اُلفت
رہی کچھ بھی نہ رغبت آشیاں سے

پڑا رہتا ہے میخانے میں زاہد
محبّت کیا ہوئی پیرِ مُغاں سے

نشانِ راہ بن کر رہ گیا ہوں
جُدا جب سے ہوا ہوں کارواں سے

بُرا کہتا ہے اکثر مئے کو واعظ
خُدا محفوظ رکھے بد زباں سے

وہ ہنس کر پوچھتے ہیں مجھ سے اخگرؔ
بھٹک کر آ گئے ہو تم کہاں سے



اک ذرا منہ کیا لگایا جام سے
ہو گئے بیگانہ صبح و شام سے

ہو سہانی لاکھ بھی شام اودھ
کیا تقابل میکدے کی شام سے

ہر کسی کو تم نظر آ جاؤ گے
اس طرح نیچے نہ جھانکو بام سے

ہے صبا میں بھینی بھینی سی مہک
مل کے آئی ہے یہ کس گلفام سے

شاعری کا یہ بھی اک فیضان ہے
ہو گئے آگاہ ہم الہام سے

عشق کر دے گا زلیخا کو جواں
بے خبر تھیں وہ خود اس انجام سے

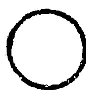
من گھڑت فتوے بھی دینے لگ گیا
واقعی واعظ گیا اب کام سے

پوچھو مُردوں سے ہیں وہ کس حال میں
یہ نہ سمجھو ہیں وہاں آرام سے

کون لے مر کر حیاتِ جاوداں
باز آئے ہم تو اس انعام سے

حُسن بکنے لگ گیا بازار میں !
جب نہ یوسفؑ بچ سکے نیلام سے

ان کا بھی اخگرؔ ہے کچھ معیارِ فکر
جو بہل جائیں خیالِ خام سے



دو شعر

ضرورت ہو تو چڑھ کر دار پر اعلان کر دینگے
انھیں پایا ہے ہم نے اور تا حدِ نظر پایا

قفس میں رہتے رہتے ہو گئے مانوس ہم اتنے
خیال آتا نہیں بھولے سے بھی اب آشیانے کا

کیا اُمید اس گردشِ ایام سے
ہو جو غافل میرے خالی جام سے

ہے بہت آرام وہ راہِ عدم
اس میں چلنا ہی نہیں ہے گام سے

سنتے ہیں اہلِ جنوں سب کی مگر
کام رکھتے ہیں بس اپنے کام سے

جا رہا ہے منہ کفن میں ڈھانپ کر
صبح کا بھولا خجل ہے شام سے

موت ہے پیغامِ وصلِ رب مگر
خوش نہیں کوئی بھی اس پیغام سے

غم پسندی قابلِ حیرت نہیں
ہے ذرا ہٹ کر مذاقِ عام سے

شمع کے جلوے نے بے خود کر دیا
ہیں پتنگے بے نیاز انجام سے

کون سی شے ہے جو دُنیا میں نہیں
صرف ہے محروم استحکام سے

جاں کنی ہیں جن کی آخر کٹ گئی
کیا ڈریں وہ نزع کے ہنگام سے

کیوں نہ ہو نفرت سی ان کے نام سے
ڈر کے مر جاتے ہیں جو آلام سے

ہے کھنک ان کی ہنسی میں اس طرح
جام ٹکرا جائے جیسے جام سے

کیا ستم ہے کوئی بچ سکتا نہیں!
ہو کے واقف بھی قضا کے دام سے

خود بخود آدم نہیں بہکے مگر
بچنے بھی پائے نہ وہ الزام سے

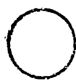
ٹل نہیں سکتا جو ہے تقدیر میں
فائدہ کیا شکوۂ آلام سے

ہجر کے ایام میں گردش نہیں
ہیں الگ یہ گردشِ ایام سے

زلف ہے عارض پہ لہرائی ہوئی
یا سحر الجھی ہوئی ہے شام سے

منہ سے کیا نکلے نہ جانے حشر میں
ہم رہیں گر لرزہ بر اندام سے

دیکھ کر اخترؔ کو فرمانے لگے
آگ لگ جاتی ہے اسکے نام سے



جب زمیں بھر جائے گی اجرام سے
پھٹ پڑے گی حدت اجسام سے

خوش ہیں آذر کیا تمہارے کام سے
پوچھ کر دیکھو کبھی اصنام سے

لطف آ جاتا ہے ضبط نفس کا
سابقہ پڑتا ہے جب احرام سے

اس صفائی سے کیا ہے اس نے قتل
خوں نہ ٹپکا تیغ خوں آشام سے

کم تو کیا مدھم نہ اب تک ہو سکی
روشنی پھیلی ہے جو اسلام سے

اس میں ہے منہ کے بگڑ جانے کا خوف
احتیاط آئندہ کر دشنام سے

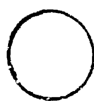
ہیں تو جزوِ ملک دونوں ہی مگر
خطرہ ہے کشمیر سے آسام سے

چاند پر بھی جا کر انسان آگیا
اور نہ نکلا حلقۂ اوہام سے

خُلد میں جانے کی اک ترکیب ہے
دوستی کر لیجیے خدام سے

یہ مصیبت تھی الگ بن باس میں
رہ گئی سیتا بچھڑ کر رام سے

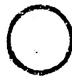
آتشِ نمرود آخر بجھ گئی !!
خالقِ نمرود کے احکام سے



دو شعر

ناؤ کھانے لگی ہے ہچکولے
پھر سے طوفاں بپھر گئے شاید

کیوں مسلّم ہو نہ علمِ بو تراب (رض)
"آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"



بہلے کیا دِل گردشِ ایام سے
بس نمٹتے رہیئے صبح و شام سے

مر کے جا کا مرنے والوں کا نصیب
ہیں وہاں آرام ہی آرام سے

شاد ہے دن کے اُجالے کی طرح
تیرگی وابستہ ہو کر شام سے

یاد دِل میں اور لب پر نام ہے
کام ہے دونوں کو اپنے کام سے

ہم نے مر کے پائی پھر اک زندگی
دام میں آئے نِکل کر دام سے

سمجھے تھے ہو گا عدم گہرا بہت
رہ گیا پُر ہو کے بس اک گام سے

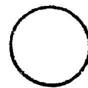
نکتہ دانی کا نہیں کوئی نصاب
درس لے لیجیے صلائے عام سے

کیسی تھی ہو سکی کی آخر تشنگی
ہو گئے سرشار بس اک جام سے

اس نے دیکھا تیز نظروں سے مجھے
رہ گئی تلوار کھنچ کر نیام سے

کیوں گریزاں سے رہیں دنیا سے ہم
شرم کرتا ہے کوئی حمّام سے

نامۂ قسمت ہے اخترؔ بے نیاز
دستخط تو دستخط ابہام سے



پوچھ کر دیکھو ذرا تم پیار سے
جوڑ کیا مجبور کا مختار سے

نامکمل ہیں ابھی پا مالیاں
پھر گزر جاؤ اِسی رفتار سے

ہو چکی تزئینِ داماں ہو چکی
کام لے کچھ دیدۂ خوں بار سے

اک ذرا تصویر لے لوں آپ کی
یوں ہی لگ کر بیٹھئے دیوار سے

آبرو پر آ بنے جس پیار میں
باز آئے ہم تو ایسے پیار سے

لیجیے ساحل پہ بھی طوفان ہے
بچ کے اب جائیں کہاں منجدھار سے

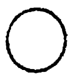
انبساطِ دل کی بھی کوئی سبیل
آنکھ تو ہے مطمئن دیدار سے

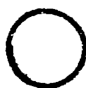
مُسکرا کر رد نہ کیجے مُدعا
حوصلے بڑھتے ہیں اِس انکار سے

آرزو ہی آرزو رہ جائے گی
عشق جب گر جائے گا معیار سے

وقت ہر اک پر اثر انداز ہے
کون بچ سکتا ہے اس کی مار سے

تم نے اختر کو ابھی سمجھا نہیں
کھیلنا اچھا نہیں انگار سے





چھٹے ہم کیا دو روزہ زندگی سے
پڑا پالا حیاتِ دائمی سے

خودی کیا چیز ہے پوچھو اسی سے
خودی میں جو گزر جائے خودی سے

مرے غم خوار اسی کو پوچھتے ہیں
نہیں جو بات کہتے کی کسی سے

ہوں چاہیں آپ سے بھی بڑھ کے خوریں
ہمیں تو کام ہے بس آپ ہی سے

ندی میں باڑھ بڑھتی جا رہی ہے
اُدھر گھر ہے مرا لگ کر ندی سے

بنا ہے اشرف المخلوق انساں
سنور کر زیورِ خود آگہی سے

کبھی ایفا ہوا ہے وہ نہ ہوگا
کیا جائے جو وعدہ بے دلی سے

بچا لیتا وہ، جس سے منحرف تھا
بدل لیتا اگر فرعون اسی سے

کوئی کس کس سے آخر دل لگائے
نہیں ہے کم یہاں کوئی کسی سے

جلی خود شمع لیکن انجمن کو
کیا سرشار اپنی روشنی سے

کرن چھوٹی جہاں سے ایسی اخگر
نکل آیا زمانہ تیرگی سے



گئے گزرے ہیں وہ دنیا و دیں سے
نہیں واقف جو آدابِ جبیں سے

فلک سیدھا نہیں ہے خود کہیں سے
مگر پھر بھی اکڑتا ہے زمیں سے

الٰہی خیر ہو بیمارِ غم کی
وہ آنسو پونچھتے ہیں آستیں سے

نہیں شاید یہ ان کا آستانہ
بہت انجان ہیں سجدے جبیں سے

دم ان کا بھرتا ہے دل کیا ستم ہے
ہمارا کھا کے باغی ہے ہمیں سے

جوابِ خط میں تم نے جو لکھا ہے
وضاحت کیوں نہ چاہوں میں تمہیں سے

نہیں وہم و گماں میں بھی فلک کے
اُٹھے ہیں ایسے فتنے بھی زمیں سے

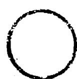
اگرچہ عشق ہے خود زور آور!
مگر دبتا ہے ظالم ہر حسیں سے

نہیں دیکھا کسی نے بھی خُدا کو
مگر ذکر اس کا کرتا ہے یقیں سے

فلک اس پر خمیدہ ہے افق میں
ستارے مِل گئے شاید زمیں سے

ہوئی کیا خاک سے تخلیق آدمؑ
مقدر نار کا پھوٹا وہیں سے

فلک کو آگ لگ جائے گی اخترؔ
نہ کھیلے میری آہِ آتشیں سے



کوئی لوٹا ہے شاید تیرے در سے
ٹپکتی ہے بڑی حسرت نظر سے

گرے جس طرح آنسو چشم تر سے
نہ گر جاؤں کہیں ان کی نظر سے

نظر کی چوٹ جو پڑتی ہے دل پر
وہ ظاہر کیوں نہیں ہوتی نظر سے

یہ گریہ اور کیا کیا رنگ لائے
لہو بہنے لگا اب چشم تر سے

میسر یوں ہوا ہے وصلِ قاتل
جدا اب سر ہے تن سے تن ہے سر سے

خبر لاتے ہیں ہم بھی لامکاں کی
نظر آتے ہیں گو بے بال و پر سے

بچے گا کون پھر میری نظر میں
نظر اونچی ہو جب ذوقِ نظر سے

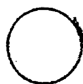
ہیں ان کی نوکِ مژگاں کے تصدق
خلش جاتی نہیں میرے جگر سے

یہ ممکن بھی نہیں ہے وقتِ آخر
ترا ہو کر ترے جلوے کو ترسے

نہیں ہے خود بخود خوشبو فضا میں
وہ شاید گزرے ہیں اس رہ گزر سے

نہ گزرا جیتے جی کوئی بھی لیکن
ہیں سب واقف عدم کی رہ گزر سے

جگر تھامے ہوئے آئے وہ اختر
میں شرمندہ ہوں آہوں کے اثر سے



ایک شعر

چلے تھے مجھ کو سمجھا کر نظر ساقی سے ٹکرائی
جناب شیخ جب سے میکدے میں بار بار آئے



اس کی رونق ہی نہ بدلی گردشِ ایام سے
اپنی شامِ غم ہی اچھی ہے اودھ کی شام سے

آگے پیچھے ہر قدم پر سامنا ہے موت کا
کیوں نہ گھبرائیں بھلا ہم زندگی کے نام سے

چھوڑیئے بھی بے ضرورت تو کوئی آتا نہیں
کچھ تو کہیئے آپ کا آنا ہوا کس کام سے

بال و پر رکھتے ہوئے پرواز کی ہمت نہیں
دام میں صیاد آجائے تو چھوٹیں دام سے

اپنے جرموں سے زمیں تو کرۂ تاریک ہے
اور دن رات آسماں پُرنور ہے اجرام سے

اپنا اپنا حوصلہ ہے اپنا اپنا ظرف ہے
کوئی آنکھوں سے پیا کرتا ہے کوئی جام سے

جب سے اپنے دل کو اخگر درد کی لذت ملی
زندگی کے دن گزرتے ہیں بڑے آرام سے



مہر و مہ بھی تو نہ چھوٹے گردشِ ایام سے
صبح سے چکر میں ہے کوئی تو کوئی شام سے

ہم تو سمجھے تھے کٹے گی زندگی آرام سے
اے محبت یاد رکھیں اب تجھے کس نام سے

ایسے بندوں کو بھلا روزِ جزا کا خوف کیا
رات دن جو ڈرتے رہتے ہیں خدا کے نام سے

جس کے قبضے میں ہے میری جان وہ مختار ہے
آپ کے کہنے سے میں خارج نہیں اسلام سے

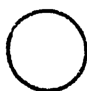
مرتبہ فرزند نے پایا خلیل اللہ ہوئے
کہیے آذر آپ نے پایا ہے کیا اصنام سے

کیوں ہے سب کی فکر، کیا دُنیا کے ٹھیکہ دار ہو
کام رکھو حضرت واعظ تم اپنے کام سے

ایسے پیغام اور اس کے لانے والے کے نثار
نقشۂ دُنیا بدل ڈالا ہے اک پیغام سے

لے کے ہم آئے تھے جملہ چار دن کی زندگی
کٹ گئی تکلیف سے کچھ اور کچھ آرام سے

سچ ہے اخگر "شاعری جزویست از پیغمبری"
اس نے شاعر کو نوازا اس لیے الہام سے



نہ بیٹھا وہ فقیروں میں نہ اُٹھا بادشاہوں سے
نہ سنبھلا عُمر بھر گر کر کوئی ان کی نگاہوں سے

چُھپیں کب تک نصیحت کرنے والوں کی نگاہوں سے
خُدا محفوظ رکھے ہم کو ایسے خیر خواہوں سے

اُدھر وہ ہیں نگاہیں نیچی کر کے جام دیتے ہیں
اِدھر ہم ہوں مجھے عادت ہے پینے کی نگاہوں سے

سرِ محشر گواہی دیں گے کیا تیرے مقابل میں
یہیں سے کم توقع ہے مجھے اپنے گواہوں سے

خُدا رکھے، ترے غم نے وہ سرمستی عطا کردی
بہت سرشار گزرے ہم غمِ دُنیا کی راہوں سے

سہارا لے کے شبنم کا فلک محفوظ ہے اب تک
وگرنہ آگ لگ جاتی کبھی کے میری آہوں سے

گناہوں کو بُرا سمجھے نہ سمجھے کوئی اے اخگر
مگر انساں بنا انساں حقیقت میں گناہوں سے

حسن سانچے میں ڈھلا ہو جیسے
خواب آذر کا جگا ہو جیسے

شاخ پر پھول کھلا ہو جیسے
اور شبنم میں دھلا ہو جیسے

کوئی میلے میں ازل کے کھو کر
یک بیک آج ملا ہو جیسے

اس کے اخلاق پہ ہوتا ہے گماں
آج وہ مجھ پہ خفا ہو جیسے

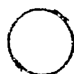
حالِ دل سن کے وہ یوں چونکا ہے
پہلی بار آج سنا ہو جیسے

حسن ہر شے میں نظر آنے لگا
اب تک آنکھوں میں چھپا ہو جیسے

ہچکیاں ایسی ہیں وقتِ آخر
دوست نے یاد کیا ہو جیسے

روشنی دیکھ کے ڈر جاتے ہیں لوگ
گھر کبھی ان کا جلا ہو جیسے

دار پہ چڑھ کے ہے یوں شاد اختر
مفت میں کام بنا ہو جیسے



پاؤں کیوں اٹھ رہے ہیں مشکل سے
ہوں ابھی کتنی دُور منزل سے

غم سے بُنیاد ہل گئی دِل کی
اور غم استوار ہے دِل سے

مجھ پہ تجھ سے بچھڑ کے کیا گزری
پوچھ اس دَرد کو مرے دِل سے

رکھ لیا ہے ترا بھرم اے دوست
دَرد بن کر اُٹھا ہوں محفل سے

غم نہ کر خاک میں ملا کے مجھے
مَیں بنایا گیا بھی ہوں گِل سے

یہ تصوّر ترا خُدا رکھے
نہیں ہٹتا کبھی مقابل سے

چلنے والے خلافِ راہِ خرد
دُور ہوتے ہیں اور منزل سے

غم دیا ہے تو غم کی تاب بھی دے
ضبطِ غم ہو رہا ہے مشکل سے

نہیں مانگا خود آپ کو اس نے
آپ ناحق خفا ہیں سائل سے

آئینے میں نہیں ہے عکس اس کا
ایک قاتل ملا ہے قاتل سے

کھیلتا ہے بہ قدرِ ظرف اخترؔ
کوئی طوفاں سے کوئی ساحل سے



آنکھ میں آنسو ہیں دل میں یاد ہے
بس اسی میں زندگی برباد ہے

چاہنے والا کہاں برباد ہے
دل کی دُنیا درد سے آباد ہے

خوب دُنیا ہے غمِ آباد ہے
ہر کوئی ہر فکر سے آزاد ہے

وہ ملے تو شکوۂ بیداد ہے
شاد ہو کر دل مرا ناشاد ہے

واجب التعمیل ہر ارشاد ہے
دِل دیا تو ہر حبہ بادا باد ہے

کر دیا مجھکو رہا پر کاٹ کر
یہ نئی صیاد کی بیداد ہے

دی شکست انسان نے ابلیس کو
واہ کیا استاد کا استاد ہے

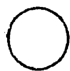
ڈھا رہا ہے پھر ستم ڈھائے ہوئے
مُفلسی میں اب ستم ایجاد ہے

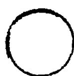
گڑگڑایا ابر تو وہ ڈر گئے
سمجھے شورِ نالہ و فریاد ہے

بھول بیٹھے آپ تو دے کر زباں
تادمِ تحریر ہم کو یاد ہے

کیا ڈریں گے ہم کسی اُفتاد سے
زندگی خود اک بڑی اُفتاد ہے

رہتے ہیں پروانے اخگرؔ دُور دُور
شمع کے لب پر یہی فریاد ہے





ان کے جلوے کی تاب لا نہ سکے
آنکھ میں ہم نظر کو پا نہ سکے

ہم عدم سے نہ لائے تھے کچھ بھی
اور کچھ ساتھ لے کے جا نہ سکے

بیخودی میں بھی پاس تھا اِتنا
نام ان کا زباں پہ لا نہ سکے

وہ کبھی کے بھلا چکے ہم کو
ہم انھیں آج تک بھلا نہ سکے

ان سے کیا ہو وصال کی اُمید
جو نظر سے نظر ملا نہ سکے

جس سے اُمیدِ ہمنوائی تھی
وقت پہ وہ بھی کام آ نہ سکے

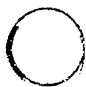
جانِ منصور کی تو لے بیٹھے
اس کی آواز کو دبا نہ سکے

ایسے غنچے بھی گلستاں میں کھلے
جھڑ گئے اور مسکرا نہ سکے

لوگ راضی نہ تھے عدم جانے
جب گئے تو پلٹ کے آ نہ سکے

لگ گئے ان کے ساتھ باتوں میں
جو سنانا تھا وہ سنا نہ سکے

عشق اک ایسا شعلہ ہے اختر
حسن والے بھی خود بجھا نہ سکے



ایک شعر

لمحات حوادث سے غافل نہ رہے انساں
اک لمحہ ہے ایسا جو جاں لے کے ہی ٹلتا ہے



در کھلے جب ثابت[1] و سیار کے
پردے سارے اُٹھ گئے اسرار کے

جب کبھی تصویرِ دوزخ آنکھ میں
سمجھے ہم معنیٰ "فنا فی النّار" کے

جانے والے واپس آتے ہی نہیں
ہیں یہ کیا اسرار کوئے یار کے

سرکشی ابلیس کو مہنگی پڑی !
ہو گئے در بند استغفار کے

جو زباں کا زخم ہے بھرتا نہیں
گھاؤ تو بھر جاتے ہیں تلوار کے

کیجئے اظہارِ حق میں احتیاط
تا نہ پائے پل نہ جائیں دار کے

وقتِ آخر بھی نظر آیا نہیں
منتظر تھے ان سے ہم جس پیار کے۔

---

[1] وہ ستارہ جو گردش نہ کرے۔

آپ گلشن میں نہ جائیں بے نقاب
گُل نہ پھر لے کھینچ لیں رُخسار کے

مِل کے ساقی سے نہیں اپنے ہیں شیخ
آئے ہیں کیا تیر کوئی مار کے

یاد کیسے رہ سکیں ماضی کے عیش!
پھول جھڑ جاتے ہیں باسی ہار کے

طور اخگر کس طرح آخر جلا
تھے عناصر نُور میں کیا نار کے؟



کیوں نہ ہم ممنوں ہوں اغیار کے
لانے والے ہیں پیام یار کے

دار پر چڑھ کر تھا کوئی سر بلند
سر تھے خم لوگوں کے نیچے دار کے

زندگی کے لُطف جی کے ساتھ ہیں
لوگ کیوں جیتے ہیں جی کو مار کے

ان سے ہم نظروں میں سب کچھ کہہ گئے
ہیں طریقے مختلف اظہار کے

فصلِ گُل آئی ہے، پینے کے ہیں دِن
وسشر بو کے اور اولی الابصار کے

وعدہ کر کے مُسکراتا ہے کوئی
یعنی پہلو بھی ہیں کچھ اِنکار کے

اس نے اک جنّت بنانے کے لیے
نقشے منگوائے ہیں ہر گُلزار کے

دیدۂ نرگس ہے کیسی نیند میں
رنگ تو ہیں دیدۂ بیدار کے

حشر کو خاطر میں لا سکتے نہیں
دیکھنے والے تری رفتار کے

چھُونے والے نذر کرتے ہیں لہو
گُل سے اچھے ہیں مقدر خار کے

کب پتنگوں کو جلایا شمع نے
وہ تو اے اخگر تھے شعلے پیار کے



بیٹھنا ہے بیچ میں جب چار کے
سیکھیے آداب بھی گفتار کے

عام ہیں جلوے جمالِ یار کے
اب مقدر طالبِ دیدار کے

فطرتاً آزاد تو ہے آدمی
کام کرتا ہے مگر ناچار کے

ہم تری محفل میں آئے بھی تو کیا
نقش بن کر رہ گئے دیوار کے

اب تو ساقی ہے محرومِ شراب
پی لیا کرتے ہیں پانی وار کے

ضبطِ غم مشکل سے مشکل ہی سہی
سامنے روتے نہیں بیمار کے

میرے شانے کا سہارا لیجیے
پاؤں تو قابو میں نہیں سرکار کے

پی گیا شاید تری جھوٹی کبھی
طور ہی کچھ اور ہیں مے خوار کے

اللہ اللہ رے نشاناتِ جبیں
ہیں محافظ نقشِ پائے یار کے

کام آئیں گے برائے مغفرت
بس یہی نعرے ھُوالغفار کے

اخگر ان کو اور بھڑکاتے ہو کیوں
پہلے سے پولے ہیں جو انگار کے



خوش رہے دل یا اسیرِ غم رہے
دم بھریں گے تیرا جب تک دم رہے

بَل نہ نکلے گا مری تقدیر کا
زُلف میں جب تک تمہاری خم رہے

چارہ گر، لے پھر نمک پاشی سے کام
اب نہ زخموں پر کبھی مرہم رہے

غیر پر ان کی رہی چشمِ کرم
ہم ہمیشہ مُبتلائے غم رہے

سر بلندی، سر فرازی ہے یہی
ان کے در پہ فرقِ تمکیں خم رہے

بُت کدے میں ہم ہوئے رمز آشنا
جو حرم میں تھے وہ نا محرم رہے

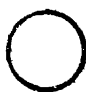
زندگی ہر چند ہے ناپائیدار
تجھ سے پیمانِ وفا محکم رہے

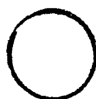
وہ بھلا کیوں کر مسیحا بن سکے
جو فقط اک موم کی مریم رہے

آدمیت کی بڑی توہین ہے
آدمی اور بندۂ آدم رہے

رنگ لائیں گی مری بے تابیاں
گر ستم ان کے یوں ہی پیہم رہے

کیسے ہو اختر سکونِ دل نصیب
بے سبب بھی وہ اگر برہم رہے





اُنھیں سُنائی کچھ اِس طرح داستاں میں نے
کہ اپنے غم کا نہ ہونے دیا گماں میں نے

ہجومِ غم ہی نہیں ساتھ راہِ اُلفت میں
بنا لئے ہیں کئی ایسے کارواں میں نے

کب آسماں سے وفا کا نباہ ممکن تھا
وفا کو زندہ رکھا زیرِ آسماں میں نے

لگا کے آگ جہاں بجلیوں نے منہ پھیرا
بنا لیا وہیں اک اور آشیاں میں نے

ہوا جو خوف زمانے میں عام ہونے کا
تو دِل میں کر لیا غم کو ترے نہاں میں نے

خیال ہی نہ گیا میرا اپنے دل کی طرف
انھیں تلاش کیا ہے کہاں کہاں میں نے

اسے نہ ڈھونڈا کبھی جو نظر سے اوجھل تھا
نہیں کی ایسی کوئی سعیٔ رائگاں میں نے

رہی نہ خود سے وہ بیگانگی اب اے اخگرؔ
کیا ہے جب سے محبت کو درمیاں میں نے

جلتا ہے کوہِ طور تو جل جانے دیجیئے
موسیٰ کی آرزو تو نکل جانے دیجیئے

اچھے نہیں جبیں پہ یہ بَل جانے دیجیئے
دِل میں بھرا ہے کچھ تو نکل جانے دیجیئے

دامن نہ گرنے والے سے اپنا چھُڑایئے
لے کر سہارا اس کو سنبھل جانے دیجیئے

روئیں گے یاد کر کے بہت ہم کو اہلِ حُسن
تھوڑی سی دھوپ حُسن کی ڈھل جانے دیجیئے

بدلیں اگر نہ آپ تو پھر کوئی غم نہیں
دُنیا بدل گئی تو بدل جانے دیجیئے

ہونے نہ دیجیے صلح رقیبوں میں بھول کر
گر ٹھن گئی ہے ان میں تو چل جانے دیجیئے

دُشمن کا جھوٹ آئے گا خود کھل کے سامنے
فی الحال ان کے غصّے کو ٹل جانے دیجیئے

دَر سے اُٹھایئے نہ کسی بے نوا کو آپ
دَر پر پڑے پڑے اسے پل جانے دیجیئے

غم شمع کو رہے گا پتنگے کی موت کا
آخر اسے بھی ساتھ ہی جل جانے دیجیئے

دُنیا میں آپ اپنا تماشا نہ کیجئے
بہتر ہے میرے غم کا مداوا نہ کیجئے

محشر سے پہلے عام نظارا نہ کیجئے
ایسا نہ کیجئے کبھی ایسا نہ کیجئے

رکھنا نہیں ہے مجھ سے تعلق ہی جب کوئی
غیروں سے میرا حال بھی پوچھا نہ کیجئے

آدمؑ کی تھی جو بات وہ آدمؑ کے ساتھ تھی
اس کے سوا کسی کو بھی سجدا نہ کیجئے

کہتے ہیں کل جسے ہے قیامت اُسی کا نام
کرنا ہی ہے تو وعدۂ فردا نہ کیجئے

"دُشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است"
وہ لاکھ بھی قوی ہو تو پروا نہ کیجئے

مانا کہ لاکھ چاہنے والے ہیں آپ کے
لیکن شمار ان میں ہمارا نہ کیجئے

کہتے ہیں وہ، کہ دیکھئے ہم کو ہزار بار
اور اس کو رکھیے راز میں افشا نہ کیجئے

اخگر کو جس نگاہ سے دیکھا ہے آپ نے
سب کو اسی نگاہ سے دیکھا نہ کیجئے

لبوں پہ نغمے خوشی کے نہ غم کے افسانے
عجیب حال میں جیتے ہیں تیرے دیوانے

مآل و حال سے اپنے اگرچہ ہیں غافل
ترے خیال سے غافل نہیں ہیں دیوانے

اگر ہے چشمِ بصیرت تو کسبِ عبرت کر
زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں ویرانے

ہمارے واسطے وجہِ سکوں بنی نہ کبھی
تمہاری یاد بھی آتی ہے ہم کو تڑپانے

ہے سنگِ در کی جگہ خاکِ نقشِ پا پہ جبیں
مرے نصیب کو بدلا ترے کفِ پا نے

نہ بُت کدے کے ہوئے اور ہم نہ کعبے کے
ہمیں کہیں کا نہ رکھا تری تمنّا نے

بُھلایا تو نے جو مجھ کو تو کیا ہوا اے دوست
ابھی تو یاد ہیں دُنیا کو میرے افسانے

وہ ایک نم کہ ہے دُنیا تمہاری ٹھوکر میں
وہ ایک میں جسے ٹھکرا دیا ہے دُنیا نے

اُٹھوں نہ گوشۂ عزلت سے عمر بھر اخگر
گھنیری زُلفوں کا سایہ ملے جو سستانے

زندگی ہے یوں فنا کے سامنے
شمع جیسے ہو ہوا کے سامنے

شک پتنگوں پر ہے شاید شمع کو
دیکھتی ہے خود جلا کے سامنے

عکس ہے میرا تری تصویر میں!
دیکھ لے آئینہ لا کے سامنے

تذکرہ اہلِ وفا کا کیا کروں
آپ جیسے بے وفا کے سامنے

منہ دکھانے کے ہی قابل ہم نہیں
اور جانا ہے خدا کے سامنے

ڈر کے خود بیمارِ غم سے ٹل گئی
ڈٹ گیا جب وہ قضا کے سامنے

آپڑے ہیں قید میں صیاد کی
آشیانے کو لٹا کے سامنے

دیکھ کر آئینہ ہے وہ دم بخود
بے وفا ہے بے وفا کے سامنے

حوصلہ دشمن میں کیا اختر ہے اگر
منہ ذرا کھولے وہ آ کے سامنے

جب ان کے حسن کا نظارہ عام ہو جائے
کچھ اور شمس و قمر کا مقام ہو جائے

نقاب اُٹھایئے رُخ سے تو دن نکل آئے
جو کھول دیجئے گیسو تو شام ہو جائے

فقط شراب سے آئے سُرور کیا ساقی
نظر ملا کے کبھی اک دورِ جام ہو جائے

کسی بہانے پہنچ جائیں گے ہم ان کے قریب
اس انجمن میں اگر اژدہام ہو جائے

نہیں ہے شیخ کو اندازہ ان کے جلووں کا
کبھی جو سامنا ہو تو غلام ہو جائے

اُٹھاؤ آنکھ کہ بس اک نگاہ کافی ہے
جو تشنہ کام ہے وہ شاد کام ہو جائے

رہے جو حد میں غمِ دل تو ناگوار نہیں
بڑھے جو حد سے تو جینا حرام ہو جائے

نہ جانے کیسے گزارہ ہو مرنے والوں کا
اگر نصیب حیات دوام ہو جائے

طلب ہو دار کی اخگر کہ طورِ سیمائی
کرو وہ کام کہ دُنیا میں نام ہو جائے



میری خواہش تو یہ ہے آٹھ پہر شام رہے
اور گردش میں لگاتار یوں ہی جام رہے

ہم بدلتے ہوئے اپنے کو ہر گام رہے
تاکہ عزت تری لے گردشِ ایام رہے

انقلابات بھی ان کے لیے ناکام رہے
جو تہی جام تھے پہلے سے تہی جام رہے

آنے پائے نہ تبسم بھی کلی کے لب پر
اس کی نظروں میں اگر پھول کا انجام رہے

واسطہ ہی نہ پڑا ہم کو کبھی ہنسنے سے
ہم کچھ اس طرح اسیرِ غم و آلام رہے

اس لیے ہوں میں طلبگارِ ستم رہ رہ کر
چاہتا ہوں کہ ترے لب پہ مرا نام رہے

ہم بچاتے ہوئے دامن کو رہے دنیا میں
جن کو رہنا تھا تہِ دام تہِ دام رہے

اس لیے ورد کرو نامِ خدا کا اختر
موت جب آئے تو ہونٹوں پہ یہی نام رہے



مجھ سے جب ان کے لوگ ہاریں گے
میرے لوگوں کو وہ اُبھاریں گے

جو بھی پڑ جائے گی سہاریں گے
اب کسی کو نہیں پکاریں گے

کہو جنّت سے اِنتظار کرے
آ کے ہم اور اسے نکھاریں گے

آشیانہ بنے گا جب اے برق
اس پہ صدقے تجھے اُتاریں گے

کہیں شرما نہ جائے وہ خود سے
ایسی تصویر ہم اُتاریں گے

جب کہ ہو جائے گی فنا دُنیا
لازماً خضرؑ بھی سدھاریں گے

خود ہی دے دیجے جو بھی دینا ہے
ہم نہ دامن کبھی پساریں گے

نفس سے ہم ہیں اشرف المخلوق
اپنے محسن کو کیسے ماریں گے

"خوئے بدرا بہانۂ بسیار"
ہم کہاں تک اُسے سُدھاریں گے

چھوڑ دیں گے حواس ساتھ جہاں
ہم وہاں بھی تجھے پُکاریں گے

گرنے دیں گے نہ اے اثر تجھ کو
اس سلیقے سے ہم اُتاریں گے

اپنی زُلفیں سنوارنے والے
میری تقدیر کیا سنواریں گے

غیر ہی جان کر وہ کھل جائے
ہم اک ایسا بھی رُوپ دھاریں گے

اخگر آ ہی گئے ہیں دُنیا میں
گزرے جیسی بھی اب گزاریں گے



میرے آنسو رواں ہو گئے
زخم دل کے عیاں ہو گئے

جب سے وہ مہرباں ہو گئے
حادثے پاسباں ہو گئے

بند کر کے زباں عشق میں
ہم سراپا زباں ہو گئے

ہم چلے ہیں تو نقشِ قدم
منزلوں کے نشاں ہو گئے

تیری اُلفت میں عاشق ترے
مٹ گئے جاوداں ہو گئے

اک یقیں دل سے کیا مٹ گیا
کتنے پیدا گُماں ہو گئے

کس کے اُبھرے یہ نقشِ قدم
راستے ضو فشاں ہو گئے

ان کے دل میں یہ کیا آگئی
مجھ سے کیوں بدگماں ہو گئے

ہو گئے ایک رنج و خوشی
آپ جب درمیاں ہو گئے

رہتے رہتے قفس میں اسیر
بے نیازِ فغاں ہو گئے

ہو کے اخگرؔ غریبِ صفی
تم تو اہلِ زباں ہو گئے



آنا پڑا مجھے کبھی جانا پڑا مجھے
نقشِ حق پہ سر کو جھکانا پڑا مجھے

ہر سانس پہ خودی کو مٹانا پڑا مجھے
یوں زندگی کا قرض چکانا پڑا مجھے

تم اہلِ دل ہو تھام کے دل کو سنو یہ بات
بہروں کو دل کا حال سنانا پڑا مجھے!

ہنستے ہنساتے کٹ گئی یہ ساری زندگی
رونا پڑا مجھے نہ رلانا پڑا مجھے

ہر گام پر اندھیروں کا تھا اس قدر ہجوم!
ہر گام اک چراغ جلانا پڑا مجھے

ماضی کے کارنامے بھلائے ہوئے ہیں لوگ
ایک ایک حرف یاد دلانا پڑا مجھے

یہ بھی ہے ایک تلخ حقیقت کہ پھر انھیں
افسانہ زندگی کا سُنانا پڑا مجھے

جن کے عمل سے دشمنی شرمندہ ہو گئی
ان دوستوں سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

یہ دَرد میرا دُشمنِ جاں تھا مگر اسے
خود جان کی طرح سے بچانا پڑا مجھے

پڑھنی پڑی کتابِ محبّت ورق ورق
کاغذ کو انگلیوں پہ نچانا پڑا مجھے

اختر عزیز تھی جو گلستاں کی روشنی
خود آشیاں کو اپنے جلانا پڑا مجھے

لا کر کہاں جنوں نے کھڑا کر دیا مجھے
دل کی ہی کچھ خبر ہے نہ اپنا پتہ مجھے

دیکھا مرا مقام تو کھو بیٹھی اپنے ہوش
دُنیا سمجھ رہی تھی کھلونا بلا مجھے

کیا اس سے بڑھ کے ہوگی کوئی اور بے بسی
تم سے بچھڑ گیا بھی تو جینا پڑا مجھے

یہ دھیمی دھیمی سانس کی لے ہے کہ ہے راز کیا
دیتا ہے کوئی دُور سے شاید صدا مجھے

حکمت کے ساتھ ہوتی ہیں تقسیم نعمتیں
گلشن کو رنگ و بو تو غمِ دِل دیا مجھے

نا محرمِ حیات کی دیوانگی نہ پوچھ
دُنیا میں رہ کے کہتا ہے دُنیا سے کیا مجھے

مَیں کیوں کسی کے سامنے پھیلاؤں اپنا ہاتھ
دیتا ہے دستِ غیب سے میرا خُدا مجھے

میری جبین جذب ترے آستاں میں ہے
لے جاؤں گا مَیں در کو نہ در سے اُٹھا مجھے

اخگر جبیں پہ ان کی پسینہ ہے بوند بوند
شبنم کے بھی نظارے سے جلنا پڑا مجھے!

چاہنے والوں میں اپنے کر لیا شامل مجھے
شکر کرتا ہوں کہ سمجھا اس نے اس قابل مجھے

آپ ہی کہیے زمانہ کیا کہے گا آپ کو
سب کے سب جب کہہ رہے ہیں آپ کا بسمل مجھے

ناتوانی نے بٹھایا صورتِ نقشِ قدم
اب تو ان کے در سے اٹھنا ہو گیا مشکل مجھے

عالمِ وحشت ہے میں ہوں اور صحرا کا خیال
کر دیا جوشِ جنوں نے اب کسی قابل مجھے

پا ہی لوں گا اک نہ اک دن منزلِ مقصود کو
مل ہی جائے گا نشانِ جادۂ منزل مجھے

بن نہ آئی جب کوئی تدبیر مجھ سے عشق میں
خود بخود تقدیر کا ہونا پڑا قائل مجھے

ہر ادا سفاک تیری، ہر نظر جلاد ہے
دیکھ اب تیرے برابر کے ملے قاتل مجھے

پڑ رہی ہے مجھ پہ جب تیری نظر بیگانہ وار
کیوں نہیں سمجھے گی بیگانہ تری محفل مجھے

کس زباں سے دردِ دل کا شکوہ اے اخگر کروں
کچھ سمجھ کر ہی دیا ہے اس نے دردِ دل مجھے

کر دیا اس کے ستم نے اب تو اس قابل مجھے
کوئی مشکل بھی نظر آتی نہیں مشکل مجھے

ہمنشیں کیسے میسّر ہو سکونِ دل مجھے
میری بے تابی جہاں کرتی ہو خود بسمل مجھے

ہو گئے آباد سب کے دل تمہاری یاد سے
اب نظر آتی نہیں خالی کوئی منزل مجھے

رو پڑا وہ سنگدل بھی، مجھ کو روتا دیکھ کر
چشمِ تر کا آج ہونا ہی پڑا قائل مجھے

نذر کر دی جان میں نے رونمائی کے عوض
تیغ میں آئی نظر جب صورتِ قاتل مجھے

بیٹھے بیٹھے ہو گئی چپ چاپ یوں شہرت نصیب
میں اسے تکنے لگا، تکنے لگی محفل مجھے

تیرے صدقے میں کسی شے کی نہیں اب احتیاج
بے سوال و بے طلب ہر چیز ہے حاصل مجھے

ناخُدا کے ہوش گم تھے زورِ طوفاں دیکھ کر
کس نے پہنچایا خدا جانے لبِ ساحل مجھے

حال نے جب مجھ سے اختر اپنی آنکھیں پھیر لیں
ڈھونڈنے نکلا پریشاں ہو کے مستقبل مجھے

علاج موت سے کرنا ہے کیا کیا جائے
مرض ہی عشق کا ایسا ہے کیا کیا جائے

اُمید کس سے ہے ماحول کو بدلنے کی
ہر ایک شخص یہ کہتا ہے کیا کیا جائے

جفا کو بھول کے راہِ وفا میں مرمٹنا
یہی وفا کا تقاضا ہے کیا کیا جائے

اُمید اُجالے کی موہوم ہوتی جاتی ہے
اندھیرا بڑھتا ہی جاتا ہے کیا کیا جائے

اُدھر ہجوم ہے ساحل پہ خیر مقدم کو
اِدھر بھنور میں سفینا ہے کیا کیا جائے

اِدھر مجھے بھی اسی راہ سے گزرنا ہے
اُدھر وہ تاک میں بیٹھا ہے کیا کیا جائے

سبھی نے غم کو نکالا ہے دھکے دے دے کر
ہمارے پانو پکڑتا ہے کیا کیا جائے

دکھائیں کیسے زمانے کو خال و خد اُس کے
وہ دونوں آنکھوں سے اندھا ہے کیا کیا جائے

میں اپنی آگ میں جلتا ہوں رات دن اخگر
کہ میرا نام ہی ایسا ہے کیا کیا جائے



بچھڑ کے رہ گئے جو لوگ عمر بھر کے لئے
تھی وہ دے گئے اک مستقل نظر کے لئے

نہ کوئی جسم ہے غم کا نہ کچھ ضخامت ہے
مگر ہے ایک بڑا بوجھ عمر بھر کے لئے

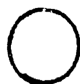
رہ خدا میں دیا اتنا دینے والوں نے
لباسِ تن کے سوا کچھ رکھا نہ گھر کے لئے

سحر کے بعد پھر اس کے لئے اندھیرا ہے
نہا لے روشنی میں شمع رات بھر کے لئے

ہوا ہے دار پہ منصور چڑھ کے سرافراز
نہیں تھی اس سے بڑی قیمت اسکے سر کے لئے

مجھے تو دیدۂ نرگس پہ رحم آتا ہے
صدی صدی سے ہے بےخوابیٔ ورکے لئے

عجب تضاد ہے فطرت کا یہ بھی اے اخگر
ہے برق دست نگر ابر کی شرر کے لئے



اِتنے پتھر ہیں میرے سر کے لیئے
ہوں رُکاوٹ نہ رہ گزر کے لیئے

جب کوئی ہمسفر نہیں ہوتا
پانو اُٹھتے نہیں سَفر کے لیئے

جانے والے گئے عدم کو مگر
تھے نہ آمادہ اس سَفر کے لیئے

بعض ایسے بھی ہیں سخی دِل کے
نہیں رکھتے کچھ اپنے گھر کے لیئے

صرف یہ دیکھنے کو روتا ہوں
کتنے دامن ہیں چشم تر کے لیئے

دیکھ سکتے ہیں سب کہاں اس کو
اس کا جلوہ ہے دیدہ ور کے لیئے

خود پہنچ جائیں گے عدم کو لوگ
ہوں پریشاں نہ راہ بَر کے لیئے

سَر چھپانا تو ہے مجھے اخگر
چھت کہاں سے مَیں لاؤں سر کیلئے



مر رہا ہوں تری خوشی کے لیے
کس کو جینا ہے زندگی کے لیے

اپنی آہوں میں یہ اثر پایا!
غم کی صورت بنی ہنسی کے لیے

اس کو راحت سے واسطہ کیا ہو
جو بنا ہی نہ ہو خوشی کے لیے

عارضی ہے یہ جانتا ہوں میں
پھر بھی مرتا ہوں زندگی کے لیے

عشق کا ایک داغ کافی ہے
خانۂ دل میں روشنی کے لیے

ذرہ ذرہ ہے اک فریبِ نظر
چشمِ بینا ہو آگہی کے لیے

ہو گیا قیدِ غم سے وہ آزاد
مٹ گیا جو تری خوشی کے لیے

دوست کی قدر جن کو ہوتی ہے
وہ تڑپتے ہیں دوستی کے لیے

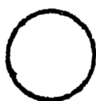
آدمیت کی شان پیدا کر
یہ ضروری ہے آدمی کے لیے

غم ہیں بھی منحرف خدا سے نہیں
یہ بھی عظمت ہے آدمی کے لیے

دل گرفتہ ہو کس لیے ہو سکی
نہیں وہ جلوہ ہر کسی کے لیے

روتی رہتی ہے رات بھر شبنم
غنچہ و گل کی تازگی کے لیے

عشق کچھ دِل لگی نہیں اخترؔ
لب ترس جائیں گے ہنسی کے لیے



بے خودی لازمی ہے خودی کے لیئے
ہاں مگر یہ نہیں ہر کسی کے لیئے

خوف کھائیں گے مرنے سے کس واسطے
ہم تو پیدا ہوئے ہیں اسی کے لیئے

سب کو دُنیا میں ہے زندگانی عزیز
کوئی دیتا نہیں جاں کسی کے لیئے

زندگی نے وفا کی ہے کب کس کے ساتھ
پھر بھی مرتے ہیں سب زندگی کے لیئے

پھر ضرورت عصائے کلیمی کی ہے
اس نئے دور کے سامری کے لیئے

پھول بنتے ہی کیوں چاک داماں ہوئی
جب خوشی کا ہے موقع کلی کے لیئے

دل گرفتہ ہے غم پا کے کیوں آدمی
غم تو اعزاز ہے آدمی کے لیئے

کون سا جذبہ اخگر ہے یہ شمع کا
آگ میں غرق ہے روشنی کے لیئے

جو نظر دِل کے پار ہوتی ہے
قابلِ اعتبار ہوتی ہے

حُسن پر جب بہار ہوتی ہے
ایک دُنیا نثار ہوتی ہے

سُرخ رُو ہیں چمن میں کانٹے بھی
ہائے کیا شئے بہار ہوتی ہے

اُس گھڑی آپ یاد آتے ہیں
زیست جب ناگوار ہوتی ہے

وہ نظر کرنے بیقرار مجھے
پہلے خود بے قرار ہوتی ہے

تھا بچھڑنا بچھڑ گئے ان سے
کیوں تڑپ بار بار ہوتی ہے

دینے والے کی دین ہے مشروط
طالبِ انکسار ہوتی ہے

نِکل آتے ہیں حل مسائل کے
جب فِضاء سازگار ہوتی ہے!

موت ہی پر نگاہ رکھ اخگر
زیست تو مستعار ہوتی ہے



مرے دور کی شان ہی کچھ نئی ہے
کئی قتل کرکے بھی قاتل بری ہے

بجھے گی نہ شمعِ محبّت بجھی ہے
اگرچہ ہوا پر ہوا چل رہی ہے

ترے غم سے وابستہ ہر اک خوشی ہے
ہے جب تک یہ دولت مجھے کیا کمی ہے

یقیناً یہ اس مہروش کی گلی ہے!!
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر روشنی ہے

جلاتے ہیں جو گھر ذرا ان سے پوچھو
یہ گھنگھور اندھیرا ہے یا روشنی ہے

خدا حافظ اے راہ بر پھر ملیں گے
ہماری جو منزل تھی وہ آگئی ہے

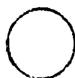
کیا اس نے انکار کچھ اس ادا سے
کہ اس میں اک انداز اقرار بھی ہے

نہ تھا رنگِ رخسار پہلے تو ایسا
تمہیں کیا گلوں کی نظر لگ گئی ہے

سیئے جا رہی ہے کلی چاک دامن
عجب پھول بننے کی جلدی پڑی ہے

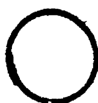
سنا ہے کہ زوروں پہ ہے ان کی محفل
کمی ہے تو بس ایک میری کمی ہے

عداوت میں پاگل ہوئی برق اختر
نشیمن جلانے کو خود بھی جلی ہے



ایک شعر

تری باتوں پہ اے ناصح یقیناً غور کر لوں گا
ذرا سی بھی اگر فرصت ملے مجھکو گناہوں سے



اِنسان مصیبت میں مشکل سے سنبھلتا ہے
ہر چیز بدلتی ہے جب وقت بدلتا ہے

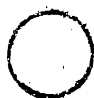
زحمت نہ ہو گر تم کو پوچھو یہ زمانے سے
کس رنگ کو اپنانے سو رنگ بدلتا ہے

تحقیق کرے کوئی آوارہ بگولے کی
کس کے لیے صحرا میں رہ رہ کے مچلتا ہے

ایثار کا جذبہ یہ بے مثل ہے برگد میں
سایہ ہمیں دینے کو خود دھوپ میں جلتا ہے

تقدیر سے کیوں اس کو منسوب کریں آخر
تدبیر سے خود اپنی جو کام نکلتا ہے

وہ لوگ جو جیتے ہیں محبوب کی حسرت میں
اخگر بڑی حسرت سے دم ان کا نکلتا ہے



زیست سے رشتہ موت کا کیا ہے
مرنے والو تمہیں ہوا کیا ہے

دل نے چاہا تمہیں بُرا کیا ہے
اس میں آخر مری خطا کیا ہے

ارض کیا چیز ہے سما کیا ہے
ابتداء کیا ہے انتہا کیا ہے

ہے بس اللہ کے نور کا پرتو
ورنہ انسان میں رکھا کیا ہے

اک بہانہ ہے اس کے دینے کا
اور اس کے سوا دُعا کیا ہے

کاش سمجھا سکے کوئی ان کو
مہر کیا چیز ہے وفا کیا ہے

تو نے دیکھا ہی کیا ہے دُنیا میں
غور سے دیکھ اور کیا کیا ہے

شعلۂ حق کے سامنے اختر
تیز سے تیز بھی ہوا کیا ہے

بد گمانی سے فائدہ کیا ہے
سن تو لیجے کہ ماجرا کیا ہے

لُٹ چکی دل کی کائنات تمام
اب مرے پاس رہ گیا کیا ہے

کیوں ہے پیرِ مغاں سے گستاخی
تجھ کو اے شیخ ہو گیا کیا ہے

آرزو رہ نہ جائے کہنے کی
کہہ ترے دل میں اور کیا کیا ہے

کیوں زباں کھول کر بیاں کروں
خود سمجھ لیجے مدعا کیا ہے

شکوۂ غم کروں تو کس منہ سے
کیا خبر مرضیٔ خدا کیا ہے

غمِ آدم ہے اب بھی ہر دل میں
آخر اس غم کی انتہا کیا ہے

جو کوئی آسرا نہیں رکھتے
کیا بتائیں گے آسرا کیا ہے

بات کہنے کی کہہ دی اخگرؔ نے
تم سمجھ لو بھلا بُرا کیا ہے



زور جب ختم ہوا لب پہ دُعا آئی ہے
ہائے کس وقت ہمیں یادِ خُدا آئی ہے

ایک کے بعد نئی ایک بلا آئی ہے
کر کے معلوم مرے گھر کا پتہ آئی ہے

آس؛ مایوسی کی شب لے کے دِیا آئی ہے
اس کے پیچھے ہی حوادث کی ہوا آئی ہے

جب کبھی میرے بھرسے کے سہارے چھوٹے
ساتھ ہی غیب سے "مَیں ہوں" کی صدا آئی ہے

صبح لہراتی ہوئی آئی گُلابی آنچل
رات اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا آئی ہے

سب پہ آتا ہے شباب ان پہ بھی آیا لیکن
دل کو تڑپانے نئی ایک ایک ادا آئی ہے

حُسن والوں سے بہت چھننے لگی ہے اخگرؔ
ہو گیا کیا تجھے، کیا تیری قضا آئی ہے



جب ان کے چہرۂ تاباں کی مجھ کو یاد آتی ہے
مری آنکھوں کے آگے برق سی اک کوند جاتی ہے

شب مہتاب میں جب زلف برہم یاد آتی ہے
یکایک ہر طرف اک تیرگی سی پھیل جاتی ہے

طلسمِ یادِ ماضی کے کرشمے اور کیا ہوں گے
مجھے کچھ دیر تک خود میری ہستی بھول جاتی ہے

خدا جانے ہو کیا اس کے مکمل حسن کا عالم
جب اسکی اک ضیا شمس و قمر کو جگمگاتی ہے

جہاں میں زندگی منہ پھیر لیتی ہے اگر ہم سے
اجل کاندھوں پہ لے جا کر عدم میں چھوڑ آتی ہے

اُجالا رات بھر دیتی ہے ہم کو شمع جل جل کر
سحر کی اک کرن کو دیکھتے ہی تھرتھراتی ہے

نہیں ہے جب تعلق ہی کوئی مجھ سے انھیں اخگر
پھر ان کی یاد کیوں ہر وقت آ آ کر ستاتی ہے

دیکھنے والی نظر خود آنکھ میں مفقود ہے
ورنہ وہ ہے ہر جگہ ہر ذرے میں موجود ہے

اس کی کوئی حد نہیں ہے آدمی محدود ہے
ہو نہ گر کوئی وسیلہ جستجو بے سود ہے

بس یہی ہے اک تعلق آدم و ابلیس میں
ایک ہے دونوں میں حاسد دوسرا محسود ہے

ہیں سفر میں زندگی کے منزلیں ہی منزلیں
جس جگہ رک جائیے بس وہ منزل مقصود ہے

ایک سرتابی کی پائی کس قدر لمبی سزا
ہو گیا مردود شیطاں حشر تک مردود ہے

تھا خدا فرعون کیسا، کیوں نہ زندہ رہ سکا
وہ تو وہ، اس کا نشاں تک مصر میں نابود ہے

آج ایسی ہر طرف ہے فرقہ واریت کی آگ
دیکھ کر شرمندہ جس کو آتش نمرود ہے

راستے سارے کھلے ہیں مسکن جبریل تک
ہاں مگر جو راستہ آگے ہے وہ مسدود ہے

پھول بننے کی خوشی شاید نہیں ہے پھول کو
چہرہ کیوں اشکوں سے اخگر اس کا نم آلود ہے



وہاں جب ذکر ہی میرا برائے نام آتا ہے
یہاں اس کا اعادہ ہم نشیں کیا کام آتا ہے

جہاں تیرا قدم اے گردشِ ایام آتا ہے
نہ کیف صبح ملتا ہے نہ لطفِ شام آتا ہے

یہ مانا آپ کا بالائے بام آنا نہیں ہوتا
ندیدہ آپ کا ہر وقت زیرِ بام آتا ہے

سلیقہ دوستی کا بھی کہیں آتا ہے دشمن کو
جہاں جاتا ہے ایسا آدمی ناکام آتا ہے

پھراتا ہے ہمیشہ دربدر آفت کے ماروں کو
تجھے کچھ اور بھی اے چرخِ نیلی فام آتا ہے

یہ انداز طبیعت ہے خطا وارِ محبت کی
خوشی سے اپنے سر لیتا ہے جو الزام آتا ہے

مری آنکھیں لگی رہتی ہیں اخگر چشم ساقی پر
نظر اس کی جدھر پھرتی ہے دورِ جام آتا ہے



وہی ہر اک مصیبت میں ہمارے کام آتا ہے
زباں پر اپنی جس کا نام صبح و شام آتا ہے

عجب ہیں یہ مقدر کی شکایت کرنے والے بھی
کبھی اتنا نہ سمجھے کس پہ یہ الزام آتا ہے

خطا کر کے بھی کب وہ موردِ الزام بنتے ہیں
غریبوں ہی کے سر آتا ہے جو الزام آتا ہے

ہوا کرتی ہے جس پر بھی نگاہِ لطف ساقی کی
ی میکش کے آگے سب سے پہلے جام آتا ہے

مٹا دو دل کے کینے کو جہاں تک جلد ممکن ہو
پرانا ہو تو اس میں اور استحکام آتا ہے

نہیں ہے میکدے میں جب کوئی تخصیص اے ساقی
ہمارے سامنے رکتے ہوئے کیوں جام آتا ہے

جاتا ہے دل پر اور بھی تکلیف میں اکثر
ے میں خیالِ راحت و آرام آتا ہے



کہاں سکوں کسی موسم کے ماہ و سال میں ہے
تمہارا چاہنے والا عجیب حال میں ہے

جھکایا جب ترے قدموں پہ سر تو ہم پہ کھلا
عروجِ ذوقِ محبت اسی زوال میں ہے

کسی روش کسی رفتار میں نہیں دیکھی
سلامتی کی ضمانت جو اعتدال میں ہے

خدا کی راہ میں ہر طرح سے فنا ہو جا
حصول سارے کمالوں کا اس کمال میں ہے

عجیب بے خبری کا ہے شہر میں عالم
خبر نہیں کہ یہاں کون کیسے حال میں ہے

شعورِ زیست کی بے مائیگی کا ہے یہ اثر
ہر اک مسافرِ ہستی رہِ زوال میں ہے

خیال و خواب کے دنیا میں سو نظارے ہیں
شہیدِ ناز مگر ایک ہی خیال میں ہے

میں دور رہ کے بھی تجھ سے قریب تر ہوں
کہ میرے قرب کی حسرت ترے خیال میں ہے

عجیب طرح سے ہے گرمِ گفتگو اخگر
یہ آج کیا ہوا کیوں اس قدر جلال میں ہے

حُسن سے جس کی نظر معمور ہے
اس کو ہر ذرہ جوابِ طور ہے

غیر نزدیک اور اپنا دُور ہے
ان کی محفل کا عجب دستور ہے

آنکھ کہتی ہے وہ ہر ذرے میں ہیں
دِل یہ کہتا ہے کہ دلی دُور ہے

دِل تڑپ جاتا ہے سُن کر نامِ دوست
رحم کے قابل بہت مجبور ہے

چھوڑیئے دار و رسن کے تذکرے
اب نہ وہ سر ہے نہ وہ منصور ہے

مسئلہ تو ہے شعورِ دید کا!
کب نگاہوں سے وہ اتنی دُور ہے

چل نہیں سکتا کسی کا اختیار!
موت کے آگے ہر اک مجبُور ہے

ہے انھیں سے دونوں عالم کا وجود
دونوں عالم میں انھیں کا نُور ہے

دل ہی دل میں ہوں میں اس سے ہم کلام
جو مری نظروں سے اخگر دُور ہے

دل کو خوشنودی تری منظور ہے
غم میں خوش ہے رنج میں مسرور ہے

وہ جوانی کے نشے میں چور ہے
حسن پر اپنے بہت مغرور ہے

تھا کبھی جو درد سے ناآشنا
اب وہی دل درد سے معمور ہے

کیا کرے منظور میری التجا
گفت و گو بھی اس کو نامنظور ہے

سیکڑوں جلوے ابھی بے تاب ہیں
گرچہ موسیٰ ہیں نہ کوہِ طور ہے

لاکھ ہو دنیا جہاں کا اختیار
دل سے جو مجبور ہے مجبور ہے

کر کے دیکھو دشمنوں سے دوستی
آزمانا ہی اگر منظور ہے

داورِ محشر کے عکسِ نور سے
عاصیوں کے منہ پہ بھی کیا نور ہے

اختر بے مایہ ہے مشتاقِ دید
روضۂ اقدس سے لیکن دور ہے

تیری چاہت نے ہم کو مارا ہے
پھر بھی چاہت تری گوارا ہے

وہ نہیں ہے نہاں نگاہوں سے
ہاں مگر دُور کا نظارا ہے

کیا کروں ایسے حُسن کی تعریف
اپنے ہاتھوں جسے سنوارا ہے

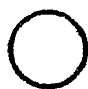
کر تو سکتا ہوں ہجو دشمن کی
کب مگر آپ کو گوارا ہے

اشک اگر آنکھ سے ٹپک جائے
ایک ٹوٹا ہوا ستارا ہے

جس کی موجوں میں زندگی گزرے
اس کو طوفان ہی کنارا ہے

سر سے کیوں جائے آپ کا سودا
جان و دِل سے مجھے گوارا ہے

رنج و غم کا گلہ نہیں اختر
مجھ کو اُلفت میں سب گوارا ہے





نام وردِ زباں تمہارا ہے
بس یہی زیست کا سہارا ہے

ہم کو طوفاں بھی اک کنارا ہے
جب خدا، ناخدا ہمارا ہے

اس کو کہتے ہیں گردشِ تقدیر
دِل ہمارا تھا، اب تمہارا ہے

جان بھی اس کے ساتھ ہی لیجے
دل پہ جب آپ کا اِجارا ہے

خود بخود جھک گئی ہے میری جبیں
ہائے کیا نقش پا تمہارا ہے

غیر کیسے تمہیں سمجھ لیں گے
کون دُنیا میں پھر ہمارا ہے

کیوں جھپکتی نہیں مری آنکھیں
کس کا جلوہ یہ آشکارا ہے

سب سہارے جہاں کے چھوٹ گئے
دل کو اک درد کا سہارا ہے

لفظ سادہ سا ہے محبت کا
ہے کنایہ نہ استعارا ہے

کر دیئے زخم دل کے پھر تازہ
اس نے ہنس کر مجھے پکارا ہے

آنکھ میں اشک ہے گہر اخگر
آنکھ سے ٹپکے تو ستارا ہے



دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
بے مزہ زندگی نہ ہو جائے

میرا رونا ہنسی نہ ہو جائے
دشمنوں کی خوشی نہ ہو جائے

دیکھ دُنیا کا اعتبار نہ کر
یہ پرانی نئی نہ ہو جائے

جس کا اندیشہ ہے محبت میں
ڈر رہا ہوں وہی نہ ہو جائے

ان کی تعریف بھی سنبھل کے کرد
باعثِ برہمی نہ ہو جائے

ہر ستم کر مگر نہ بھول سے مجھے
بے بسی، بے کسی نہ ہو جائے

کیوں ہے ہر وقت بے تکا سا جواب
دیکھیے بے تکی نہ ہو جائے

قابلِ احترام ہوتی ہے
دوستی، دِل لگی نہ ہو جائے

حد سے بڑھنے نہ دیجے ہمدردی
دوستی، دشمنی نہ ہو جائے

پرسشِ حال اس طرح تو نہ کر
اور حالت بُری نہ ہو جائے

آرزو کو ہوا نہ دو اخگر
مُدعا، مُدعی نہ ہو جائے



آگ خود اپنے نشیمن میں لگا دی جائے
برق کو اور بھی جلنے کی سزا دی جائے

بھائی سے دور ہے اک بھائی خود اپنے گھر میں
کیوں نہ آنگن کی وہ دیوار گرا دی جائے

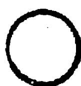
زندگی قید بھی ہے تو ہے دل و جاں سے قبول
کیوں نہ اس قید کی میعاد بڑھا دی جائے

چاہے ویران سہی، پھر بھی خدا کا گھر ہے
کیا ضروری ہے کہ مسجد وہ گرا دی جائے

نہیں ایسا کہ وہ سنتا ہی نہیں بندوں کی
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے صدا دی جائے

قدرداں کوئی وفا کا نہیں جب دنیا میں
کیوں نہ یہ رسم ہی دنیا سے اٹھا دی جائے

راہ پر رند نہیں آئیں گے تا ہم اختر
راہ میخانے کی واعظ کو دکھا دی جائے



موقع ہے داستانِ غم اپنی سُنا تو دے
آئینہ اس کے ظُلم کا اُس کو دِکھا تو دے

آئے گا بھائی سامنے تو دِل بھر آئے گا
دیوار ہے جو صحن میں اس کو گرا تو دے

دُشمن پہ بر ہی یہ دکھا دے کہ گر نہیں
اس کے قصور کی اسے کوئی سزا تو دے

دیکھیں گے ہم فرشتے اکڑتے ہیں کس طرح
انساں کی طرح ان کو دلِ مبتلا تو دے

قتل عمد نہیں نہ سہی، قتل ہی تو ہے
قاتل ہمارے قتل کا کچھ خوں بہا تو دے

بے آس ہو کے پہلے تو جینا محال ہے
جی لیں گے خیر کم سے کم اِک آسرا تو دے

دیتا ہے وہ صدا یہ صدا اس میں شک نہیں
دینے کی طرح آخر اسے اک صدا تو دے

پا سکے ہم خود نہ اس کو، فاصلہ تھا ہی نہیں
تھا رگِ جاں ہی میں وہ، ہم سے جدا تھا ہی نہیں

ہٹ کے در سے آپ کے، در دوسرا تھا ہی نہیں
اور ہر جا جھکنے والا میرا ماتھا ہی نہیں

آدمی ہونے کے ناطے چوک ہم سے ہو گئی
آشنا سمجھے اسے جو آشنا تھا ہی نہیں

حیرت اس پہ ہے نکیرین آئے کیسے قبر میں
جب ہوا کے واسطے بھی راستہ تھا ہی نہیں

جانے والے دیکھنے کو کیوں پہاڑوں پر گئے
دیکھنے کا جب کسی کو حوصلہ تھا ہی نہیں

رہنما ہر دور میں ہر قوم کے گزرے مگر
جیسے وہ تھے ویسا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں

پوچھتے کس سے سفینہ ہو گیا غرقاب کیوں
ساتھ ساحل پر ہمارے ناخدا تھا ہی نہیں

ہم زمیں پر کیوں بسر کرتے نہ زیرِ آسماں
سر چھپانے اور کوئی آسرا تھا ہی نہیں

صرف اندازہ پہ اختر ہم عدم میں آ گئے
ورنہ رستے میں تو کوئی نقشِ پا تھا ہی نہیں

پا سکے ہم خود نہ اس کو، فاصلہ تھا ہی نہیں
تھا رگِ جاں ہی میں وہ، ہم سے جدا تھا ہی نہیں

ہٹ کے در سے آپ کے، در دوسرا تھا ہی نہیں
اور ہر جا جھکنے والا میرا ماتھا ہی نہیں

آدمی ہونے کے ناطے چوک ہم سے ہو گئی
آشنا سمجھے اسے جو آشنا تھا ہی نہیں

حیرت اس پہ ہے نکیرین آئے کیسے قبر میں
جب ہوا کے واسطے بھی راستہ تھا ہی نہیں

جانے والے دیکھنے کو کیوں پہاڑوں پر گئے
دیکھنے کا جب کسی کو حوصلہ تھا ہی نہیں

رہنما ہر دور میں ہر قوم کے گزرے مگر
جیسے وہ تھے ویسا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں

پوچھتے کس سے سفینہ ہو گیا غرقاب کیوں
ساتھ ساحل پر ہمارے ناخدا تھا ہی نہیں

ہم زمیں پر کیوں بسر کرتے نہ زیرِ آسماں
سر چھپانے اور کوئی آسرا تھا ہی نہیں

صرف اندازہ پہ اختر ہم عدم میں آ گئے
ورنہ رستے میں تو کوئی نقشِ پا تھا ہی نہیں



ملی ہے آگ جہنم کو غمزدہ دل ہے
ملا ہے اسکو وہی، جو کبھی جسکے قابل ہے

یہ فائدہ ہوا کشتی کو تہہ نشیں ہو کر
بڑے سکون سے ہے بے نیاز ساحل ہے

نہ کوئی بس میں ہے اُن کے نہ ان میں ہے وہ بات
ہمارے بعد تو کچھ اور رنگِ محفل ہے

ہم آ گئے تو نہیں ہیں بھٹک کے دُنیا میں
کسی طرف سے چلیں ہر قدم پہ مشکل ہے

پکاریں اُسکو جو مشکل کُشا ہے مشکل میں
مگر تمیز ہی مشکل کُشا کی مشکل ہے

خُدا ہے جتنا خبر گیر اپنے بندے کا
ستم ہے اتنا ہی بندہ خدا سے غافل ہے

جو اُسکو دینا ہے دیتا ہے بے طلب اخگر
نہ جانے آدمی پھر کیا سمجھ کے سائل ہے

سرخ رو ہر طرح وہ خلق خدا رہتی ہے
جو ہر اک حال میں راضی بہ رضا رہتی ہے

مہکی مہکی ہوئی گلشن کی فضا رہتی ہے
جب مہک پھولوں کی پھولوں سے جدا رہتی ہے

حد سے بڑھ جائے انا تو ہے سزاوار اس کی
وصف بنتی ہے اگر حد میں انا رہتی ہے

لحظہ دو لحظہ ٹھہر کر وہ چلے جاتے ہیں
دیر تک دل میں قیامت سی بپا رہتی ہے

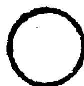
چاند سورج سے زیادہ ہے مرا دل روشن
جب سے اس میں تری وحدت کی ضیا رہتی ہے

زلف بکھرا کے سر بام وہ جب آتے ہیں
منہ چھپائی ہوئی تا دیر گھٹا رہتی ہے

بند اس واسطے رہتی ہیں کلی کی آنکھیں
ان میں آغازِ جوانی کی حیا رہتی ہے

دل دکھانے سے کبھی ماں کا نہیں رکتی اولاد
اور ماں اس کے لیے وقف دعا رہتی ہے

رسم کے طور پہ جلتے ہیں پتنگے اخترؔ
اور اک شمع ہے شعلوں میں سدا رہتی ہے



ٹکرائی نظر جوں ہی مقابل کی نظر سے
تلوار وفا کر نہ سکی دستِ عمر رضؓ سے

لوٹی ہیں دعائیں مری ناکام سفر سے
کچھ لا نہ سکیں مانگ کے تاثیر کے در سے

اچھی نہیں ہر وقت کی یہ آئینہ بینی
واقف نہیں تم اپنی نگاہوں کے اثر سے

اللہ کرے آنچ نہ آئے کوئی ان پر!
گھبرائے ہوئے نکلے ہیں وہ غیر کے گھر سے

نیت میں کسانوں کی کوئی کھوٹ ہے شاید
بادل جو برسنے کے تھے وہ بھی نہیں برسے

شیطان قوی ہے بہت انساں کے مقابل
رہتا ہے مگر حد میں وہ اللہ کے ڈر سے

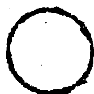
بھٹکا نہ کبھی راہ، عدم کا کوئی رہرو
واقف نہ تھا حالانکہ وہ اس راہ گزر سے

وہ روشنی دے سکتا ہوں دنیا کو میں اخگر
جو روشنی ممکن ہی نہیں شمس و قمر سے

بہ تقریب عقد جناب سعید بن شہران مالک شہران موٹر مچھلی کمان

شادی

۱۹۶۷ء



عیش کی ذمہ دار ہے شادی ٭ زندگی کی بہار ہے شادی
ہے رسولِ کریم کی سنّت ٭ حکم پروردگار ہے شادی
زندگی کو سنوار دیتی ہے ٭ سب کی حاجت برار ہے شادی
ہر خوشی ہے اسی سے وابستہ ٭ کس قدر خوشگوار ہے شادی
ہو مبارک سعید بن شہران ٭ رحمت کردگار ہے شادی
پھول گلشن کے ہی نثار نہیں ٭ آج تجھ پر نثار ہے شادی
عیش کیوں تجھ سے ہم کنار نہ ہو ٭ تجھ سے جب ہم کنار ہے شادی
یہ سکھاتی ہے زندگی کے اصول ٭ واقفِ روزگار ہے شادی
کام جتنے خوشی کے ہیں اُن میں ٭ دیکھئے شاہکار ہے شادی
دولہا دلہن رہیں خوش و خرم ٭ ساتھ لیل و نہار ہے شادی
سب کے دل ہیں خوشی سے مالامال ٭ کتنی سرمایہ دار ہے شادی

میرے ہر ایک شعر میں اخگر
وردِ لب بار بار ہے شادی

مصنفؒ کی دیگر مطبوعات

- تلامذۂ صفی اورنگ آبادی سنہ ۱۹۹۱ء (تحقیق و تذکرہ) ۶۰ روپے
  (آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کی انعام یافتہ)
- خیالات حاوی (مجموعہ کلام) سنہ ۱۹۹۲ء ۶۰ روپے
- اصلاحات صفی اورنگ آبادی سنہ ۱۹۹۳ء ۶۰ روپے
- شعلۂ سخن (مجموعہ کلام) سنہ ۱۹۹۴ء ۵۰ روپے

- محاورات صفی اورنگ آبادی (زیر طبع)
- خمریات صفی اورنگ آبادی (زیر طبع)
- صفی اورنگ آبادی کے خطوط (زیر طبع)